تمہید

مثنوی قران السعدین خسرو

نوشتہ

سید حسن برنی بی اے

مہتمم دفتر کلیاتِ خسرو و جنرل سپرنٹنڈنٹ صدر دفتر تحصیل مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

تمہید

مثنوی قِرانُ السّعدین خسرو

نوشتہ

سیّد حسن برنی بی اے

ایں سخن چند کہ بیخواست ست
شاعری نیست ہمہ راست ست

(از مثنوی قران السّعدین)

تمہید

قرانِ السعدین

مضمون	صفحہ
(۱) یادِ رفتگاں، اعتراف و شکریہ	۱-۵
یادِ رفتگاں بسلسلۂ خسروی	۱
مولانا اسمٰعیل مرحوم کی خدمات متعلق سلسلۂ خسروی	۲
مولانا کی ادبی خدمات	〃
مولانا کے مختصر حالات	۳
مولانا کی تعلیمی خدمات	〃
اعتراف و شکریہ بسلسلۂ ترتیبِ کلّیاتِ خسرو	〃
راقم کی مولانا سے ملاقات بسلسلۂ مذکورہ	۵
قرانِ السعدین کی تنقید مولانا کی اخیر تصنیف ہے	〃
(۲) خسرو کی طبعزاد مثنویوں بالخصوص قرانِ السعدین کی خصوصیات	۶-۴۰
مثنویاتِ خسرو کی دو قسمیں "اتباعی" اور "طبعزاد"	۶
"اتباع" کے صحیح معنی	〃
طبعزاد مثنویوں میں قرانِ السعدین پہلی مثنوی ہے اور اپنا جواب نہیں رکھتی	۷

صفحہ	مضمون
	(ا) پہلی خصوصیت "تاریخی اہمیت"
۸	خسرو کی مثنویوں سے تاریخ ہند کے پنجاہ سالہ معتبر حالات دستیاب ہوتے ہیں
۹	قران السعدین کے تمام واقعات خسرو کے چشم دید ہیں
	ان واقعات کے عینی مشاہدہ کے متعلق خسرو کے بیانات
۱۰	(۱) خط از غرۃ الکمال مشتمل بر حالات روانگی و رسیدن با ودہ و کیفیت ہجر و مفارقت
۱۳	(۲) خط از اعجاز خسروی مشتمل بر حالات ملاقات کیقباد با پدر خود و ملاقات خسرو و شمس
	دبیر و اثیر و رفتن خسرو با ودہ
۲۰	مختصر حالات شمس دبیر و اثیر الدین
	(ب) دوسری خصوصیت "واقعیت"
۲۲	واقعیت کے معنی اور اس کے دو پہلو، انتخاب جزئیات اور تفصیل کوائف
″	قران السعدین میں واقعیت کا کمال
۲۳	وصف نگاری کا واقعہ نگاری سے تعلق
″	انتخاب جزئیات اور تفصیل کوائف کی مثال قران السعدین سے
۲۴	مناظر فطرت کی مصوری اسی خصوصیت کے تحت میں داخل ہے
″	مثنوی قران السعدین میں مناظر فطرت کا بیان
	(ج) تیسری خصوصیت "ادراک نفسانیات و حفظ و تفریق شخصیات"
۲۵	تاریخی مثنویوں میں اس خصوصیت کو پورا کرنے کی آسانی اور دقت
″	"وصف نگاری" اور "ادراک نفسانیات" در اصل واقعیت کے خارجی اور داخلی پہلو ہیں
۲۶	داخلی پہلو کو پورا کرنے کی دشواری اور خسرو کو اس کا احساس
″	قران السعدین کے اشخاص قصہ

مضمون	صفحہ
کیقباد	۲۷
خسرو کی مثنویاں اس عہد کی تاریخ کا آئینہ ہیں	〃
قران السعدین کی غزلیات تیسری خصوصیت کے تحت میں داخل ہیں	〃
یہ غزلیات مجرّد جذبات کے لباس میں تمام قصّہ کو بیان کر دیتی ہیں	۲۸
غزل پر لفظِ شاعری کا سب سے زیادہ اطلاق ہو سکتا ہے	۳۰
شاعری کے معیار پر قران السعدین کی غزلیات پوری اُترتی ہیں	〃
خسرو کی غزل سرائی خاص رنگ رکھتی ہے	〃
قران السعدین کی غزلیات اس مثنوی میں ایک پُرلطف تنوّع پیدا کر دیتی ہیں	۳۱
(د) چوتھی خصوصیت "جدّت"	
خسرو کی طبیعت جدّت پسند اور طرفہ آفرین تھی اور تقلید میں بھی حرّیتِ ذہنی کو برقرار رکھا گیا ہے	۳۱
مثنوی قران السعدین جدّت کا نمونہ ہے	۳۲
جدّتِ شاعری کا تعلق تخیّل سے اور تخیّل کی اہمیت	۳۳
خسرو کے تخیّل کی کیفیت	〃
تخیّل کی مثال مغلوں کی ہجو سے	〃
(ہ) پانچویں خصوصیت "تناسب"	
فنونِ لطیفہ میں تناسب کے معنی	۳۸
مثنوی میں تناسب قایم رکھنے کی دشواری	۳۹
قران السعدین اور تناسب	〃
(۳) قران السعدین میں دہلی قدیم کے متعلق تاریخی معلومات	۴۰-۵۱

مضمون	صفحہ
قران السعدین کے بعض نسخوں میں اس مثنوی کا نام "مثنوی در صفتِ دہلی" کیوں لکھا پایا جاتا ہے	۴۰
دہلی کے متعلق معلومات	"
اِس کا لقب "قبۃ الاسلام" تھا	"
شہر پہاڑی پر آباد تھا	"
دہلی کے تین حصار تھے	۴۱
قصرِ معزی واقع کیلوکھڑی	"
"شہرِ نو" (کیلوکھڑی) کی بنیاد کیقباد سے بہت پہلے پڑ چکی تھی	۴۴
دہلی کی عمارات	۴۵
مسجد جامع میں نو گنبد تھے اور "درون" کا سلسلہ غیر مسقّف تھا	۴۶
منارۂ ماذنہ اور اُس کے اوپر کے درجے کی کیفیت	۴۷
حوض سلطاں	"
مضافات دہلی	۴۹
سیری اس وقت سبزہ زار تھا	"
اندپت	"
تلپت	۵۰
بہاپور	"
افغان پور	"
دہلی اور مضافات دہلی کا نقشہ	مقابل صفحہ ۵۱
(۴) قران السعدین کا سلسلۂ تواریخ وشہور وسنین	۵۱-۵۵
قران السعدین میں کن تواریخ کا صراحت سے ذکر پایا جاتا ہے	۵۱

مضمون	صفحہ
واقعات کا سلسلہ قایم کرنے سے قران السعدین کے اصل واقعہ یعنی ملاقات کی تاریخ اخیر جمادی الاوّل ۶۸۶ھ قرار پاتی ہے	۵۳
جلوس کیقباد کی تاریخ اوائل ۶۸۶ھ قرار پائی ہے	”
خسرو کے قیام اودھ کی صحیح مدت کیا ہے اور بظاہر جو اختلاف خسرو کے بیانات میں پایا جاتا ہے وہ کس طرح رفع ہوتا ہے	۵۴
(۵) قران السعدین میں مدح شیخ کے موجود نہونے کی وجہ	۵۶-۵۷
مدح شیخ کا التزام خمسہ اور بعد کی مثنویوں میں	۵۶
قران السعدین اور خمسہ سے پہلے کی دوسری مثنویوں میں مدح شیخ کا نہ پایا جانا عدم تعلقات کو ظاہر کرتا	”
(۱) خود خسرو کے ابتدائی دیوانوں میں مدح شیخ موجود ہے	”
(۲) معتبر ترین تواریخی شواہد ثابت کرتے ہیں کہ شیخ کے ساتھ خسرو کا تعلق عنفوان شباب سے پیدا ہو گیا تھا	”
اس فروگذاشت کی وجہ	۵۷
(۶) ہندوستان کا خسرو پر اور خسرو کا ہندوستان پر اثر اور مثنوی قران السعدین کا اخلاقی نتیجہ	۵۷-۶۱
مثنوی قران السعدین کا ایک قصہ طلب شعر جسمیں ایک ہندی لفظ سے لطیفہ پیدا کیا گیا ہے	۵۷
ہندی الفاظ کا خسرو کے یہاں آزادانہ استعمال	۵۸
خسرو کی شاعری کی اہم اور سبق آموز خصوصیت "ہندوستانی"	”
خسرو ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں	۵۹
خسرو اُس عہد کے صحیح نمایندہ ہیں	”
خسرو کا ہندوستان کی تاریخ پر گہرا اثر پڑا ہے	”
خسرو کا ملک کی مشترک تہذیب کی ترقی میں خاص حصہ ہے	۶۰
قران السعدین کا اخلاقی نتیجہ	۶۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ اللہ! آج سے چار برس پہلے جب کلیاتِ امیر خسروؒ کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا تو ملک میں ابھی تک وہ بزرگ موجود تھے جو ماضی کو سمجھتے اور اُسے حال و مستقبل سے روشناس کر سکتے تھے۔ حالی، شبلی اور اسمٰعیل اسی کاروانِ قدیم کے سالارِ راہ تھے۔ لیکن یہ قافلہ مرحلہ پیمائی کر چکا تھا، اور اُن کے نقوشِ قدم بہت جلد اُس منزل تک پہنچنے والے تھے جس سے آگے گم شدگانِ عدم کا سراغ نہیں لگتا۔ اُس زمانے میں مولٰنا حالی پیرانہ سالی سے معذور اور پابرکاب تھے۔ مولٰنا شبلی کا قلم ابھی تک ہاتھ سے نہ چھوٹا تھا، لیکن سیّافِ اجل کمیں لگائے بیٹھا تھا۔ مولٰنا اسمٰعیل بھی اپنے دوسرے معاصرین کی طرح آفتابِ لبِ بام تھے۔ لیکن کمرِ ہمّت چست باندھکر منزلِ مقصود کی رہ پیمائی کے لیے آمادہ ہو گئے۔ گردشِ ارضی کے دو تین دور وہ اس وادی میں مرحلہ پیما رہے۔ جب کہ منزلِ مقصود کے دُھندلے نشان

دکھائی دینے لگے تھے اور اُمید کی شعاعیں کوشش کے راستہ کو منوّر کر رہی تھیں، یکایک داعیِ اجل نمودار ہوا، اور مولانا لبیک کہکر اپنے ساتھیوں سے، جو کسی قدر پہلے روانہ ہو چکے تھے، جا ملے ؎

مجلسِ یاراں پریشاں شد زبادِ تندِ دہر ✿ برگ ریزی گوئی اندر گلستاں آمدید

سلسلۂ خسروی میں "حیات" کا قرعہ مولانا کے نام ڈالا گیا تھا، بعد میں مثنوی قران السّعدین بھی اُن کے سپرد ہوئی۔ اُن کی عمر کی آخری ڈھائی برس اسی علمی مشغلہ میں گذرے۔ اِس مدّت میں قران السّعدین پر مکمّل تنقید لکھی، حیاتِ خسروی کے لیے بہت سا مواد جمع کیا اور سوانح عمری کے چند اجزا، ترتیب دے لیے جن میں معز الدین کیقباد کے اخیر عہد (۶۸۹ھ) تک خسرو کے حالات درج ہیں۔ افسوس قضا نے اتنی مہلت نہ دی کہ یہ عظیم الشان علمی منصوبہ مولانا کے ہاتھوں سر انجام پا جاتا۔ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو سہ پہر کے وقت پچھتّر برس کی عمر میں چند روزہ علالت کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔

مولانا اسمٰعیل ہمارے لٹریچر کے اُن معدودے چند مربیوں میں سے ہیں جن کا نام شہرتِ عام حاصل کر چکا ہے، اور کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ نثر و نظم دونوں میں ملک کے چند بہترین اہلِ قلم میں شمار ہوتے تھے۔ بچّوں کے لیے اُن کا تصنیف کیا ہوا درسیات کا سلسلہ آج تک بے مثل مانا جاتا ہے، اور اُن کی اخلاقی اور نیچرل نظمیں قبولیتِ عامّہ حاصل کر چکی ہیں، اور گھر گھر پھیلی ہوئی ہیں۔

مولانا کی زندگی ملک کے سامنے ایک قابلِ قدر نمونہ پیش کرتی ہے۔ وہ ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ کے ایک گاؤں میں جس کا "لاوڑ" نام تھا پیدا ہوئے تھے۔ ۱۶ برس کی عمر میں ہی فکرِ معاش دامنگیر ہو گئی۔ سررشتہ تعلیم میں نہایت قلیل تنخواہ پر نوکری اختیار کی۔ لیکن خداداد قابلیت نے اپنے لیے راستہ نکال لیا۔ اواخر ۱۸۹۹ء میں جب اُنھوں نے پنشن لی تو وہ نارمل اسکول آگرہ میں ہیڈ مولوی تھے۔ اپنے قلم کی بدولت اُنھوں نے دنیا کی ثروت اور عزت حاصل کی۔ اُن کی کتبِ درسیہ جو اُردو مدارس میں عرصہ تک داخلِ نصاب رہیں لاکھوں کی تعداد میں نکلیں، اور اب تک رائج ہیں۔ گورنمنٹ نے اُن کے تعلیمی خدمات کے اعتراف میں "خاں صاحب" کا خطاب دیا جس سے زیادہ مناسب اُن کے لیے "شمس العلما" کا خطاب ہو سکتا تھا۔

وہ تعلیم کے خاص طور پر دلدادہ تھے، اور "قلمے، قدمے، درمے" ہر طرح اپنی زندگی علم اور اشاعتِ تعلیم کے لیے وقف کر دی تھی۔ اُن کی یہ تعلیمی خدمت بھی خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسلمانانِ میرٹھ میں (جہاں اُنھوں نے سکونت اختیار کر لی تھی) تعلیمِ نسواں نے اُنھیں کی مساعیِ جمیلہ سے ترقی حاصل کی۔ ۱۹۱۰ء میں اُن کی تحریک سے مدارسِ نسواں کا افتتاح ہوا، جن کی نگرانی اُنھوں نے اپنے ذمے لی، اور اخیر تک نہایت تندہی سے اُسے انجام دیتے رہے۔ علاوہ ازیں وہ ہر قسم کی مفیدِ عام تحریکوں میں حصّہ لینے کی کوشش کرتے تھے۔

وابستگانِ سلسلۂ خسروی پر اُن کا بہت بڑا احسان ہے، اور اُن کی خدمات

پورے طور پر اعترافِ خاص اور اظہارِ شکریہ کی مستحق ہیں۔ انھوں نے ابتداءً یہ علمی کام، فخرِ ملک و ملت اور شیدائے علم و فن نواب حاجی محمد اسحٰق خاں صاحب بہادر آنریری سکریٹری مدرستہ العلوم کی فرمائش سے مخلصانہ تعلقات کی بنا پر قبول فرمایا تھا۔ آغازِ کار کے بعد مولنا کو اس مشغلے سے ایسا عشق پیدا ہو گیا تھا کہ اخیر تک وہ اسی میں منہمک رہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ فرمایشی کام (خواہ اس کی کوئی نوعیت ہو) لوگوں پر بار ہوتا ہے لیکن مولنا کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی۔ اُن کے شغف کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اکثر ایّام علالت میں بھی وہ بستر پر لیٹے لیٹے کچھ نہ کچھ خسرو کا کام کرتے رہتے تھے۔ سلسلۂ خسروی میں اُنھوں نے اپنا تمام قیمتی وقت بغیر کسی قسم کا معاوضہ قبول کیئے صرف کیا، اور جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دُنیا میں بہت کم لوگ ایسا استغنا دکھا سکتے ہیں تو مولنا کا ایثار خاص طور پر ہمارے دل میں اُن کی وقعت پیدا کر دیتا ہے۔

راقمِ آثم کو کئی دفعہ "خسروؒ" کے سلسلہ میں مولنا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ اُن سے ملکر سچی روحانی خوشی ہوتی تھی، اور اُن کے بزرگانہ اخلاق اور علم و فضل کا دل پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ خسروؒ کے ساتھ تعلقِ خاطر بہت بڑھ گیا تھا۔ خسروؒ کا کلام نہایت ذوق و شوق کے ساتھ سناتے تھے۔ ایک مرتبہ فرماتے تھے "خسرو عجیب و غریب شخص تھے سچ یہ ہے کہ اِس سے پہلے ہم اُنھیں اتنا بڑا نہ جانتے تھے، لیکن اب جب تفصیل کے ساتھ اُن کے کلام کو دیکھنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ وہ کیا تھے"۔ ایک دفعہ وسط الحیوٰۃ سے "خانِ شہیدؒ" کے مرثیہ کے کچھ بند سنائے اور اس سے بے مثل ترجیع بند کی

خاص تعریف کی۔ مرثیہ کا ایک بیت بہت پسند تھا جسے کئی کئی دفعہ پڑھکر سنایا ؎

"کشتگاں اُفتادہ در اطرافِ آں صحرای سبز ہمچو صورتہا کہ در دیباے اخضر بافتند"

ایک مرتبہ فرماتے تھے کہ "امیر کے کلام میں صنایع بدایع بہت ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ان تکلفات سے دوسروں کی شاعری پر بُرا اثر پڑجاتا ہے، لیکن خسرو کے یہاں اکثر اسقدر بے تکلف اور بامزہ ہیں کہ اُن کی وجہ سے لطفِ شاعری بڑھ جاتا ہے" مثال کے طور پر قِران السّعدین سے یہ شعر پڑھا اور کئی دفعہ دُہرایا ؎

آبِ دُر را ز تاج و قبا و کمر تا بکمر تا بہ گلو تا بہ سر (صفحہ ۸۴)

قِران السّعدین کی تنقید جو مثنوی مذکور کے ساتھ اس وقت ناظرین کی خدمت میں پیش ہے مولٰنا اسمٰعیل مرحوم کی اخیر مکمّل تصنیف ہے۔ اس کے لکھنے میں مولٰنا نے پوری جانکاہی سے کام لیا ہے۔ اُن کی تحریر سلیس اور خالص اُردو کا بہترین نمونہ ہوتی ہے۔ زبان شُستہ اور خیالات سلجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ طولِ کلام سے وہ ہمیشہ بچتے ہیں لیکن اختصار کے ساتھ کہنے کے قابل جتنی باتیں ہوتی ہیں وہ سب بیان کر دیتے ہیں یہ سب خوبیاں اس تنقید میں موجود ہیں جو ناظرین کے سامنے ہے۔

اس تنقید کے بعد قِران السّعدین پر کسی مزید تبصرہ کی گنجایش نہیں ہے۔ البتہ اس مثنوی کے متعلق محض ضمناً چند متفرق امور بیان کیے جاتے ہیں جن سے یا تو تنقید کے بعض ضروری نکات کی توضیح و تنقیح مقصود ہے یا اس مثنوی کے بعض تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا مرکوز ہے۔

(۲)

خسرو نے جس قدر مثنویاں لکھی ہیں ان کی دو جداگانہ قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں اوّل وہ مثنویاں جو اتباعاً لکھی گئی ہیں۔ دوم وہ مثنویاں جو طبع زاد ہیں۔ پہلی قسم میں خمسہ کی پانچوں مثنویاں ہیں جن میں خمسۂ نظامی کا تتبع کیا ہے۔ دوسری قسم میں متعدد چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور قران السعدین، عشیقہ، نہ سپہر، اور تغلق نامہ داخل ہیں۔

مثنوی نگاری میں خسرو نے جابجا اپنے آپ کو نظامی کا متبع بتایا ہے۔ اس اتباع کی دو حیثیتیں ہیں جن میں فرق کرنا ضروری ہے۔ ایک اتباع وہ ہے جو خمسے میں کیا ہے۔ یعنی نظامی کی پانچوں مثنویوں کے جواب لکھے ہیں۔ دوسرا اتباع اس سے بالکل جدا ہے جو محض زمانی حیثیت سے اُن پر عاید ہوتا ہے۔ ارتقائے تمدن کے دوسرے شعبوں کی طرح لٹریچر کی تاریخ میں ہر پیچھے آنے والا پہلے آنے والوں کا پیرو ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مثنوی میں خسرو نظامی کے ایسے ہی متبع ہیں جیسے نظامی فردوسی کے یا فردوسی دقیقی کے متبع تھے۔ اس اتباع سے خسرو کی "شخصیت" پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثنوی نگاری میں اُن کی ذاتی خصوصیات کافی طور پر نمایاں ہیں اور غور کرنے سے صاف نظر آجاتی ہیں اور اُن کی شاعری کو نظامی (یا کسی دوسرے مثنوی نگار) سے اسی طرح بیّن طور پر متمائز کر دیتی ہیں جس طرح نظامی کی خصوصیات اُن کی شاعری کو فردوسی یا سعدی سے جدا کرتی ہیں۔ یہ خصوصیات خسرو کی طبع زاد مثنویوں میں بدرجۂ غایت غالب ہیں۔ اسی وجہ سے طبع زاد مثنویوں کے متعلق یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہاں پر ان کا اتباع

فی الحقیقت محض اُس قسم کا اتباع ہی جو متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین پر تاریخی حیثیت سے ہمیشہ عاید کیا جاتا ہی۔

اِس بحث کو زیادہ پھیلانے کا موقع نہیں ہی۔ قران السعدین (جو بڑی مثنویوں میں سب سے پہلی طبعزاد مثنوی ہی اور جو خمسے سے دس بارہ برس پہلے لکھی گئی تھی) اس وقت ہمارے سامنے موجود ہی۔ یہ مثنوی فارسی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور اپنے رنگ میں بالکل انوکھی کتاب ہی۔ اس مثنوی کے لیے خسرو کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہ تھا، اور ہمارے علم میں خسرو کے بعد اس کا جواب نہیں لکھا گیا۔ اگر لکھا گیا ہو تو وہ ایسا ہی جسے کوئی نہیں جانتا۔

---

۵ منیر نے ایک چھوٹی سی مثنوی "درصفت بنگالہ" لکھی ہی جس میں وصف نگاری کا التزام کیا ہی جو بلاشبہ خسرو کا اتباع ہی۔ لیکن یہ مثنوی قران السعدین کے جواب میں نہیں لکھی گئی ہی، اور نہ بجز وصف نگاری کے خسرو کی مثنوی کے ساتھ اس میں کوئی مشابہت پائی جاتی ہی۔ مثلاً کشتی کی تعریف میں منیر نے بھی چند اشعار لکھے ہیں جو بغرض دلچسپی ناظرین درج ذیل کیے جاتے ہیں:

ز کشتی بل کمانِ دل نشینے + بہر گوشہ در و چلہ گزینے + ندانم تیر او چوں می کند کار + کہ نے پیکانش کس دیدہ نہ سوفار
کمانش گفتم و الحق ہمانست + سیہ ملّاح او زاغِ کمانست + اگر سہراب باشد ور بہیمن + نیارد ایں کماں تنہا کشیدن
نہ آنست ایں کماں تنہا ایں کماں بہ + ولی ہرگز نہ شد شایستۂ زہ + کرا اندیشۂ امن و امان ست + کہ طوفاں جاشنیِ ایں کمان ست
بود چنگے کنارِ آب جایش + ز فیضِ رود ہا سازِ نوایش + مگر زیں چنگ در یا گشتہ خوشحال + کہ کف بر کف زند ہر دم چو قوال
ازاں ماند بچنگِ نغمہ پرواز + کہ باشد بادبانش پردۂ ساز + شبیہِ او ہمہ از چنگ جوئید + ولیکن اہلِ ہندش ناؤ گویند
بود پیرِ کہن سالیش زیباست + ز شوقِ آب جانش ناشکیباست + محاسن از قطاسش گشتہ پیدا + بر وہم پیر و ہم برناست شیدا
بروں آورد ریشِ دلپسندی + بچندیں کوسہ دارد ریشخندی + کند با موجِ بحر آہنگِ آشوب + تراشد دست و پای خویش از چوب
بیابد تا سراغِ آشنائی + زند ہر دم بدریا دست و پائے + گزارش تا سوِ آب اوفتادہ + عنانِ جنبش بدست باد داده
دمادم علمِ دریا کردہ تکرار + معلم تختۂ او گشتہ صدبار + پرستارش بہ غم چرخ پیر + پزد ہر لحظہ سودائے ہریسہ
نمیدانم چہ بیماریش دیدند + کہ آلش از شکم بیروں کشیدند + بود او را سبک رفتاری ایں سال + رود درہ با ہزاراں پائے چوبیں
سبک پا نیست بارا دگرانست + ولی پالش بدستِ دیگرانست + ازاں دریا بہ او سر کردہ آشوب + کہ دریا را گرفتہ در تہِ چوب

ہم یہاں مختصر طور پر خسرو کی طبعزاد مثنویوں کی خصوصیات بیان کرنا چاہتے ہیں اور اسی بحث کے ضمن میں قران السّعدین پر بالتخصیص نظر ڈالینگے۔ اس کو پڑھتے وقت یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان خصوصیات میں سے بعض جُدا جُدا دوسرے شاعروں کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن ان کا اجتماع جس طرح خسرو کے یہاں ہوا ہے دوسری جگہ نہیں ہے۔

سب سے پہلی خصوصیت خسرو کی طبعزاد مثنویوں کی یہ ہے کہ تقریباً تمام تاریخی مثنویاں ہیں۔ ان مثنویوں کی بنیاد واقعات پر ہے۔ محض شاعرانہ خیال آفرینی پر نہیں ہے۔ عشیقہ حُسن و عشق کی ایک سچّی اور دردناک داستان ہے جس میں عہد علائی اور ما بعد کے مُستند تاریخی حالات درج ہیں۔ نُہ سپہر میں علاءالدین کے رنگیلے جانشین قطب الدین مبارک شاہ کی تخت نشینی کے بعد کے مفصّل واقعات ہیں جو اُس عہد کی کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملسکتے۔ تغلق نامہ میں خلجیوں کی بربادی اور تغلقوں کی سربرآرائی کی پوری داستان ہے۔ وسط الحیوٰۃ میں بلبن کے عہد کی مثنویاں ہیں جن میں طغرل پر فوج کشی اور بلبن کے بڑے بیٹے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷)

بجا ماندہ دو سوئے او سیاہ ال
نشستہ چوں دو سوئے چشم مژگاں

قران السّعدین میں صفتِ کشتی کے اشعار صفحہ ۱۴۵ تا صفحہ ۱۴۸ کو ان اشعار سے مقابلہ کر کے دیکھو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ ..... ہندوستان میں کشتی سال کی لکڑی سے بنائی جاتی ہے۔ اس کو خسرو نے کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ماہِ نوے کا صلِ وے از سال خاست + گشت یکے ماہ بدہ سال راست۔ اس کے مقابل نیر کا شعر ہے۔ بودیر کہن سالیش زیباست + زشوقِ آب جانش ناشکیباست۔ اس شعر میں مصرعِ اولیٰ اور مصرعۂ ثانی میں کوئی خاص ربط نظر نہیں آتا علاوہ ازیں سال کا لفظ بالکل بھرتی معلوم ہوتا ہے وہ لطافت و موزونیت کہاں جو خسرو کے شعر میں اس لفظ سے پیدا ہو گئی ہے جس کے لطف نے جامی کو عرصہ تک سرگرداں رکھا تھا۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے

سلطان محمد (سلطان شہید) کے غزوات درج ہیں۔ غرۃ الکمال میں جلال الدین خلجی کی فتوحات کی تاریخ ہے۔

چھوٹی مثنویوں کو بھی اگر شمار کیا جائے تو عہد بلبنی سے لے کر خاندانِ تغلق کے آغاز تک تقریباً بچاس برس کی ہندوستان کی مسلسل تاریخ امیر خسرو کی مثنویوں سے مرتب ہو سکتی ہے جو سند اور اعتبار کے لحاظ سے اس عہد کے متعلق قطعاً بے مثل ہے۔ یہ مثنویاں انھیں ایام میں تصنیف ہوئی ہیں جب کہ وہ واقعات پیش آئے جو ان مثنویوں میں درج ہیں، اور بیشتر واقعات خود خسرو کی چشم دید ہیں، جن کے دربارِ دہلی سے ذاتی اور خاندانی تعلقات ابتدا ہی سے اسقدر گہرے تھے۔

قران السعدین میں جو واقعات درج ہیں وہ تمامتر خسرو کے چشم دید ہیں۔ جس وقت کیقباد کا لشکر دہلی سے چلا ہے خسرو بھی اُس کے ہمراہ تھے اور باپ اور بیٹے کی ملاقات کے وقت بھی وہ موجود تھے۔

مولانا اسمٰعیل صاحب مرحوم نے بدایونی کی طرح خسرو کے ایک قصیدے سے کیقباد اور ناصر الدین کی ملاقات کے وقت خسرو کی موجودگی کا قیاس کیا ہے۔ یہ قیاس بالکل صحیح ہے، اور اس کے متعلق خسرو کے دوسرے بیانات صراحت کے ساتھ موجود ہیں۔ دیوان غرۃ الکمال میں اپنے بھائی تاج الدین کے نام ایک خط ہے جس میں اُنھوں نے لشکرِ شاہی کے ساتھ دہلی سے روانہ ہونے اور اپنے اَودھ پہنچنے کے مفصل حالات بیان کیے ہیں۔ اعجازِ خسروی میں ایک اور خط ہے جس میں کیقباد اور ناصر الدین محمود کی

ملاقات اور اس موقع کے متعلق اپنے ذاتی حالات لکھے ہیں۔ چونکہ ان دونوں خطوں کا قران السّعدین سے براہِ راست تعلّق ہے اور بعض جزئیات پر ان سے روشنی پڑتی ہے اس لیے ان دونوں خطوں سے ضروری مقامات نقل کیے جاتے ہیں۔

تاج الدین زاہد کے نام

(از غرۃ الکمال)

خواہند زمن خراب سینہ　　خسرو نہ کہ بندہ کمینہ

می گوید و می نہد شغبناک　　چوں قطرۂ اشک روئے بر خاک

کانروز کہ گشتم از برت دور　　ق　محروم شدم چو سایہ از نور

بر عزم سفر عناں کشادم　　خونابہ ز دیدگاں کشادم

با لشکرِ شاہ کوچ بر کوچ　　در گریہ ہمی شدم بہر کوچ

تا بعد دو ماہ از رہِ دور　　آمد باودھ سپاہِ منصور

سلطان نظرے بلطف بکشاد　　و اقطاعِ اودھ بخانِ ما داد

شد شہر اَوَدھ حوالۂ خاں　　شد دہر ابد نوالۂ جاں

با آں کہ نداشتم صبوری　　افتاد سکونتم ضروری

اس کے بعد شہر اَوَدھ کی تعریف اور ملک امتیاز الدین علی بن ایبک (حاتم خاں) کی توجہات کا ذکر ہے۔

ہر دم نظرے بتربیت نو　　از چشم کرم بکارِ خسرو

آخر میں دردِ فراق کا اظہار اور عزیزوں دوستوں اور دار السلطنت کی یاد ہے

لیک از غمِ دوریت چنانم   کز تن بلب آمدست جانم

شبہا منِ دل بغم نوازی   با یادِ تو در خیال بازی

دل سوختہ چون چراغ گشتہ   صد جا بدرونہ داغ گشتہ

دردے و ہزار آہِ جان سوز   آہے و ہزار تیرِ دلدوز

دل رفتہ و تن بخاک ماندہ   جان بر شرفِ ہلاک ماندہ

یا آنکہ ازین ولایتِ خوش   یارے دو سہ اند نغز و دلکش

از حالتِ من در آرزویت   عاشق شدہ ہمچو من برویت

با من ہمہ انست شب و روز   دل سوختہ را قناعت آموز

نے قاصدِ تو رسد بسویم   نے باد رساند از تو بویم

کو آن بوفا بہم نشستن   دل در طرب و نشاط بستن

گہ دادنِ دُرِّ نظم چون نوش   از دُرجِ دہن بحلقۂ گوش

گاہے بدیہۂ دل آویز   سفتن گہرے بخامۂ تیز

گاہے غزلے بجواب گفتن   گاہے سخنِ شراب گفتن

گہ جامِ نشاط نوش کردن   گہ زمزمۂ تر بگوش کردن

گہ کردن گشت سوئے بتسار   گاہے بطوافِ حوضِ سلطار

ہر شب منم و دلے و دردے   غم را بدو چشم آب خوردے

شب روز کنم ز آهِ جانسوز　　زین گونه بود شبِ مرا روز

یکشب من و دل چراغ در پیش　　جانے بهزار داغ در پیش

بودیم بهم بگفت و گویے　　محرم نه کسے جز آرزویے

گفتم که ازین اسیر بیداد　　یاد آیدت یا نیایدت یاد

تا حال بدانیم که چونم　　وز دیده چگونه غرقِ خونم

روشن کندت زبانِ خامه　　حالِ من ازین فراق نامه

ماهِ رجب و شبِ سه شنبه　　یک هفته حساب رفته بر نه

تاریخ ز هجرت ار کنم یاد　　بر ششصد و هفت و هشتاد
سنه ۶۸۷ھ

غدار شبے ز ابر تاریک　　بارنده بقطرهاے باریک

عین شبگال وقتِ باران　　خیمه زده ابر را سواران

بکشاده بناله رعد را کام　　برده دهلِ خروش بر بام

می گفت ترانه ابرِ سرمست　　بود آب برقص و برق می جست

باران بهوا بقطره سازی　　قطره بزمین بحلقه بازی

گریه ز من و ز ابر هم یاد　　بیرون و درونِ خانه نم باد

تا وقتِ سحر قلم در انگشت　　در تاریکی همی زده مشت

چون نیست تکلفے بدر روم　　در نامه تکلفے نکردم

صنعت بسخن نکردم آغاز　　تا قصه نماند از غرض باز

چوں تنگ پذیر شد مقالت　　صنعت بود آں نہ حسب حالت
یک بیت زگفتۂ نظامی　　تضمیں کنم اندریں تمامی
کارائش کردنی زحد بیش　　رخسارۂ قصہ را کند ریش

یہ خط سہ شنبہ ۱۶ رجب ۶۸۶ھ کا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکر شاہی دو مہینے کے سفر کے بعد اودھ پہنچا۔ جس وقت بادشاہ اپنے باپ سے مل کر دہلی کو واپس ہوا ہے، برسات کا موسم تھا، اودھ پہنچنے پر غالباً اپنے بھائی کے نام ان کا یہ پہلا خط ہے۔ خسرو محبت والفت کا مجسمہ تھے قدرت نے انھیں درد وسوز کی غیر معمولی مقدار عطا فرمائی تھی۔ عزیزوں اور وطن کی محبت نے انھیں زیادہ دن اودھ میں نہیں رہنے دیا اور اس خط کے لکھنے سے تین چار مہینے بعد ہی وہ اودھ سے روانہ ہو کر ذوالقعدہ ۶۸۶ھ میں دہلی پہنچ گئے۔ اس کی تفصیل آگے آئیگی۔

بنام "خداوند وبرادرم..... نجم الملۃ والدین"

(از اعجاز خسروی رسالۂ پنجم)

دوستدار یگانۂ خسرو سلطانی. . . . . . . بر آں رائے انور. . . . . . .
مصوّر می گرداند کہ . . . . خداوند ملک ملوک الشرق وقطب ارکان الممالک
اختیار الحق والدین . . . . علی ایبک سلطانی.....از اوج ارتفاع بچشم سعادت
درکار بندہ ناظر ست ولیکن دل بندہ کہ از تافتگی آفتاب فراق در ہوائے

دوستان فرّه ذرّه شده است۔ نه در آسمان ست نے در زمیں۔

مقرو آں ضمیر مستنیر می گرداند کہ اندرانچہ سلطان مشرق ناصر الدین . . . .

والدنیا . . . از مقام محمود چوں نیرِ اعظم بر عزم کشور کشائی تیغ زناں راہ قطع

کردہ باقطاعِ اَوَدھ در رسید ہلالِ رایتش در آبِ سرو چوں ماہ از برج سرطان

رویت نمود . . . . . و از یں جانب سایۂ عنایت پروردگار جہانگیر مشرق و مغرب

معز الدنیا والدین کیقباد . . . . . چترِ خورشید تابِ ظل الٰہی را ہم بر لبِ آب

مذکور چوں آفتاب در خانۂ ماہی مستقیم گردانید۔

آں چہ لشکر بود کز جنبیدنش — زلزلہ در چار ارکان در گرفت

لرزۂ بیرق زبندِ نیزہا — گوئی آتش در نیستاں در گرفت

پائے در گلِ ماند خیل آسماں — گرد کاندر چرخِ گرداں در گرفت

روزِ اوّل ایں دو بحر زاخر بوجہ توجہ اگرچہ آئینۂ آب درمیان بود مواجہ نمودند۔

مرج البحرین یلتقیان بینہما برزخ لا یبغیان۔ روزِ دیگر قران السعدین و اجتماع

نیّرین گردشِ دوران ارزانی داشتند، و برہان جمع الشمس والقمر علی الملا

مبرہن و مبین گردانیدند۔ شبہ نیست کہ بواسطۂ مباینت بینہما دیدار قیامت افتادہ

بود۔ و قیامت ایں بود کہ رویتِ آخرت ہم بلقیہ اولی در حساب آمد۔ مگر یوم النشور

بود کہ آں دو آسمانِ رفعت آیتِ اذا الکواکب انتثرت باقلامِ جاریۂ مژگاں بر

صفحات وجنات می نگاشتند و جمہور خلایق بدیں باعثہ دراں محشر حشر کردہ دراں

عرصات می گشتند۔

ناگاہ ذاتِ منوّرِ شمس الدین دبیر نوّر اللہ الی یوم الدین چوں آفتاب قیامت بر سرِ ایں ذرّہ آمد طلعت الشمس کشمس الطلعہ از گرمی آں مہر بر خود بسوختم و خونم از حرارتِ درونی بیروں جوشید۔ از احتراق طاقتِ آں نداشتم کہ سوئے او توانم دید۔ مع ہذا چشم بحالش تیز کردم۔ آب در چشم من بگشت۔

آب در چشم بگردد چو ببینی خورشید خاصہ خورشیدے کش خانہ بود اندر چشم

دیدم کہ از عفونتِ ہوائے ہندوستان آں چشم بر آب خود نماندہ بود، بلکہ آفتاب مرا بدید و از جائے خود برفت۔ بحیلہ بسیار بحالش آوردم۔ نحو تشبکات از دورانِ روزگار در میان آورد کہ شیوۂ آبای علوی و امہات سفلی است کہ ابنائے جنس اخوانِ انس را چوں بنات النعش از ہمدیگر متفرق و متغرب می دارد۔ قدرے از قدر اقدارِ خویشتن بزبانِ حال لا بلسان المقال بلباسے ہر چہ پوشیدہ تر کشف می کرد کہ درچہ از انچہ بود عالی شدہ بود و از بر آمد دولتِ خویش اَلشَّمْسُ لَا یَخْفٰی فِیْ کُلِّ مَکَانٍ گشتہ رفعہ اللہ فی مشارق الارض و مغاربہا۔ ہر یک از اصحاب را یاد کرد، علی العموم می کرد، علی الخصوص آں نجمِ ثاقب را۔

بگریہ گفت کہ آمد بسے ستارہ بچشم
ستارہ کہ مرا باید آں بچشم نیامد

آں روز بوقتِ غروب بمقامِ خویش باز گشت۔

روزِ دیگر ہوائے اثیرالدین محمد آثارہ از بس کہ اثیر حرقت در باطن

ایں سوختہ ظاہر شدہ بود خویشتن را در آب زدم و گذرانہ عزم گذار اکردم

حالے کہ ایں خاکے از آب بگذشت سراسیمہ وار در ہوائے اثیر معلق بین

السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ می رفت تا باثیر رسید۔ چوں باراں محیط آتش طبیعت

گرم ہنگامِ نمازِ خفتن نبود، بہ تعجب می گفت ؎

ایں تو ئی یا بخواب می بینم

کہ بشب آفتاب می بینم

شبا روزے بدیدار آں عزیز شب را بروز و روز را بشب آوردہ شد ؎

خجستہ روزے کاید بشب بہ دی عزیزاں

پس از ہزار شب و سہ ہزار روزِ جدائی

الغرض روزِ سوم ہم از بامداد ملک الآفاق شمس الدین عزیمت کشتی کرد و

بندہ خسرو کہ قایم مقام تیر ست در آں کشتی با قامت بندگی راست بایستاد ؎

گرد بر چشم خیالِ یارِ من کشتی رواں

آفتابے بود کاں بر روئے دریا می گذشت

شک نیست کہ آں فراتِ جیحون موج از بحر بالا تر بود، بلکہ از بحر می گذشت و بحر را

کہ خراج گذارِ جود او ست از وجود او غیرت بحاصل می آمد۔ فی الحاصل نزدیک

چو ترہ تابشی کہ در رفعت سر نفلکِ فلک می رسانید، برسید و پرسید تا کشتی را بر لبِ آب برکنارِ اُمیدِ آشنایان بایستانند۔ تا گر آشنائے بر روئے آب می آید کہ آشنائی آشنائے گزشتہ برآب خویش باز آورد۔ و بیشترے راندنِ کشتی از برائے آن نجم علا بود۔ چون زمانے برآمد و بعد از زمانے چون ستارۂ مقصود برنیامد می گفت ؎

چگونہ رانم کشتی ستارہ پیدا نیست
مگر ستارہ نہاں شد درابر دیدۂ من

از ہنگامِ طلوعِ آفتاب تا زوالِ نہار برکرانۂ نہر آں مردمِ دیدہ را چشم می داشت و از کواکبِ مراد عکسے ہم در آب نمی دید ؎

آرے نتواں ستارہ دیدن در روز

بر روئے من بارقہ از مہر بارقتِ تمام روشن می کرد و در معاینۂ ایں سر و در معاینہ می گفت ؎

من کہ شمسم ہمہ تن مہر شدم از سر سوز
ذوقِ آں دست نہاں ماندہ چو سیّارہ بہ مہر

بعد از انتظارِ بسیار بندہ را وداع کرد و آیت العود خیرٌ برخواند۔ و دیوانِ خاص کہ نظمش از نثرہ و شعرے سخن میگوید یادگار بکاتب سپرد، و خود بمقر دولت رسانید، و نادیدنِ آں عزیز را بر تقدیرِ خدائے علیم حوالہ کرد۔
وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ، بندہ باتقلب تکبیر

و قلبِ بے سکون از اں میثاق بوثاق آمد.......

تمامت روز دریں تحیّر می بودم کہ یارب اگر مجلسِ شمسی آں نجمِ علا بچشم آمدی نوراً علیٰ نور بودے۔

روزِ دیگر بدرِ منیرِ مملکت را از حضیضِ مشرق باوجِ ارتفاع رجعت افتاد و ماہِ اعلامِ اعلیٰ بر سمتِ دار الملکِ جلال منزل بمنزل بر طریقِ سریع السیر گشت کہ در ہیچ منزل باآں نجم مقابلۂ سعادت میسّر نگشت کہ سوختگیِ شمس و اثیر دیدہ بر روئے آب آورد ؂

سوزے کہ بسینہ دارم آخر روزے
در خدمتِ تو بروئے آب آرد چشم

ہم در اثنائے راہ مخدومِ بندہ بمنزلتِ اقطاعِ اودھ شرفِ دست بوسی یافت بندہ کہ چوں عطارد در شعاعِ آں آفتاب ست نتوانست کہ بخانۂ خویش راجع شود ضرورت باستقامت آں طرف رضا داد۔ ملکِ بے مثال لطلبِ مثالِ ولایت بر موافقت رکابِ فرقد سائے اعلیٰ منطقۂ جوزا بر میاں بست و در ظلِ ظلیل ہمائے ہمایون چتر کہ نسرِ طائر سایہ نشینِ اوست، طیراں نمود۔ و بندہ را کہ بلبلِ حدیقۂ صداقت ست باز گردانید۔ باشارت رائے مختار اختیائے از اتصالِ کوکبۂ اصحاب لشکر نقلِ ضروری اختیار افتاد و بہ ظلمتِ ہندوستان کہ اقلیمِ زحل ست ہبوط کردہ شد۔

موسمِ باراں بود چشمۂ خورشید با سرطان آشنائی درآمده و سرطان منقلب آبی گشتہ۔ در عینِ باران و بارانِ عین چوں آبِ سرد بجانب اَوَدھ واں کردہ شد۔

ابری بارد و من می شوم از یار جدا ✦ چوں کنم دل بچنیں وقت ز دلدار جدا

ابر و باران و من و یار ستادہ بوداع ✦ من جدا گریہ کناں ابر جدا یار جدا

باران آیتِ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بہ بانگِ بلند می خواند، و بادِ واضعِ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ بر صحیفۂ آبِ مسلسلِ رواں نقش می کرد و سبزہ بخطِ ترِ تفسیرِ لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَّنَبَاتًا بر تختۂ خاک ثبت می فرمود، و آب پیرامنِ خطِ مسلسلِ سبزہ جدولِ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ می کشید با چنداں آب در سوادِ بستاں

ترگشت خطِ سبزہ و لے پاک نہ شد

مردمِ چشم از شرحِ فراقِ دوستاں رشحے متیرا وید و ابر چوں ہواخواہاں می گریست پاے مرکبم در آبِ چشمہا می لغزید، و برق چوں مسخرگاں می خندید

چگونہ برق نخندد کہ ژالہ سنگ انداز

حبابِ شیشہ گری را کشادہ کردہ دکاں

تقاطرِ قطرات از عبراتِ من عبارتی می نمود، و بارقۂ برق از احتراقِ من حرفے .....

تا بریں طریق ایں خراب از معمورۂ اَوَدھ آمد تا ایں قصۂ غصہ را بداں جنابِ رفیع رفع کرد فی الغرۃ من شہر رجب المرجب عظم اللہ ترجیبہ سنہ سبع و ثمانین و ستمائۃ انتظارِ قطرہ ازاں دائرِ دوات آں کہ قلمِ شہاب

۶۸۷ھ

سیر بجاریِ احوال جاری دارد، واخبارِ متواتر راکہ موجبِ علمِ قطعی ست
چوں کتابی کہ از بالا آید فرود فرستد، دازدرجۂ محبت دقیقۂ فرونگزارد۔ مدارج
ارتفاع بعتبۂ علیا مدرّج باد۔ آمین۔

یہ خط قران السعدین کے اصل واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مضمون سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیقباد اور محمود کی ملاقات کے موقع پر مکتوب الیہ کے آنے کی توقع تھی لیکن وہ کسی وجہ سے وہاں نہیں پہنچ سکا۔ یہ خط یکم رجب ۶۸۷ھ اور پچھلے خط سے پندرہ روز پہلے کا لکھا ہوا ہے جس میں خسرو نے خاص طور پر اپنے دوستوں شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر الدین سے ملاقات کے واقعات بیان کیے ہیں۔

نانا کے مرنے کے بعد جس وقت خسرو کا ملک چھجو کے یہاں تعلق ہوا ہے ان دونوں سے اسی زمانے میں دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے تھے۔ شمس الدین اور اثیر الدین سلطان ناصر الدین (بغرا خاں) کے مصاحب تھے اور اکثر اس کے ہمراہ ملک چھجو کے یہاں جو سلطان مذکور کا چچا زاد بھائی تھا آتے اور شعر و سخن میں خسرو کے حریف مجلس بنتے تھے۔ اس کے بعد جب خسرو نے سلطان ناصر الدین کے یہاں ملازمت اختیار کی تو دونوں سے تعلقات اور زیادہ ہو گئے۔ جس وقت مہم طغرل کے بعد سلطان بلبن نے بغرا خاں کو لکھنوتی (بنگال) کا حکمراں مقرر کیا تو خسرو اور اثیر الدین اور شمس الدین شاہزادہ مذکور کے ہمراہ تھے۔ وطن اور عزیزوں کی محبت میں خسرو تو دہلی چلے آئے، لیکن ان کے دونوں دوست شاہزادہ مذکور کے ساتھ لکھنوتی رہ گئے۔ خسرو کا دہلی پہنچنے کے بعد

شہزادہ سلطان محمد (سلطان شہید) کے دربار سے تعلق ہوگیا اور اس کے ہمراہ پانچ برس تک ملتان رہے۔ شہزادۂ مذکور کی شہادت کے بعد کوئی دو سال گوشہ نشینی میں گذارے اب اس موقع پر جب دہلی اور لکھنوتی کے لشکر اودھ میں ملے تو برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست آپس میں بغلگیر ہوئے۔ اس دوران میں شمس الدین دبیر کا تقرب سلطان محمود کے یہاں بہت کچھ بڑھ گیا تھا چنانچہ سلطان محمود نے جس وقت باربک کے پاس (جو لشکر کیقباد کے ہراول کا سپہ سالار تھا) پیغام بھیجا ہے تو شمس الدین دبیر کو اس پر متعین کیا تھا۔

قران السعدین میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے۔

تیغ زن مشرق از آنسوی آب | تیغ بروں آختہ چوں آفتاب
جست رسولے کہ گزارد پیام | ہرچہ بگویند بگوید تمام
گرسخن از صلح بود یا نبرد | کم نکند ہیچ زنیروے مرد
دید کہ کس نیست زبرنا و پیر | درخور ایں کار چوں شمس دبیر

(قران السعدین ص ۱۰۸)

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ خسرو کے معاصرین میں شمس دبیر کا مشہور ادبا اور شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر رخصت کے وقت شمس دبیر نے اپنے عزیز دوست کو اپنا دیوان بطور یادگار دیا ہے۔ بدایونی نے منتخب التواریخ میں شمس دبیر کا کچھ کلام نمونۃً درج کیا ہے۔

(دیکھو صفحہ ۲۶۰ منتخب التواریخ مطبوعہ نولکشور)

دوسری خصوصیت خسرو کی طبعزاد مثنویوں کی یہ ہے کہ ان میں واقعیت

کا سررشتہ کمال احتیاط کے ساتھ برقرار رکھا گیا ہے۔ امیر داستان کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شاعری کے ساغر میں حقیقت ہمیشہ عریاں نظر آتی ہے اس خصوصیت کا خود انھیں بھی پورا احساس تھا اور اس کی طرف اُنھوں نے فخر کے طور پر جا بجا اشارہ کیا ہے۔

اس خصوصیت کے دو پہلو ہیں اوّل یہ کہ واقعات صحت کے ساتھ بیان کیے جائیں، دوسرے یہ کہ بیانِ واقعات میں انتخابِ جزئیات اور تفصیلِ کوائف پر کامل دستگاہ ہو۔ خسرو کی مثنوی نگاری میں یہ دونوں پہلو بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں اُن کی معلوماتِ عامّہ غیر معمولی ہیں اور ان معلومات سے شاعرانہ مصوّری میں پوری طور سے کام لینا آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو شاعرانہ سحر کاری کے باوجود اُن کا کلام حقیقت سے متجاوز نہیں ہوتا اور دوسری طرف اُس میں وہ تمام جزئیات موجود ہوتے ہیں جو شاعرانہ مصوّری میں تصویر کشی کے خطوط اور رنگ آمیزی کے قایم مقام ہوتے ہیں۔

پہلی خصوصیت اور دوسری خصوصیت کی اجتماع کی وجہ سے خسرو کی مثنوی نگاری کو "تاریخی نقّاشی" سے تعبیر کرنا بے جا نہ ہوگا۔

واقعیت کی خوبی ان دونوں لحاظ سے قران السّعدین میں کامل طور پر پائی جاتی ہے کُل قصّے کی کائنات صرف اسقدر ہے کہ بلبن کے انتقال کے بعد اس کا پوتا کیقباد تختِ دہلی پر متمکّن ہوتا ہے۔ کیقباد کا باپ ناصر الدین محمود لکھنوتی میں حکمراں ہے۔ وہ اپنے باپ

بلبن کے انتقال اور اپنے بیٹے کیقباد کی تخت نشینی کی خبر پاکر اور اپنے آپ کو تختِ دہلی کا وارثِ حقیقی سمجھکر ہندوستان پر لشکر کشی کرتا ہے۔ باپ کی لشکر کشی کی خبر سنکر بیٹا بھی اپنی فوج لیکر دہلی سے بڑھتا ہے۔ شہر اَوَدھ کے قریب سرجو ندی کے کناروں پر دونوں لشکر صف آرا ہوتے ہیں لیکن باہم نامہ و پیام کے بعد صلح ہو جاتی ہے اور باپ بیٹے سے آکر ملتا اور اُسے اپنے ہاتھ سے تخت پر بٹھا دیتا ہے۔ یہ بظاہر کوئی اہم یا مہتم بالشان واقعہ نہیں ہے، لیکن شاعر کی سحر کاری دیکھو، مواد کی کمی اور واقعہ کی قلیل النتاجی کو "وصف نگاری" کے پردے میں اس طرح چھپایا ہے کہ قصّے کی بے مائیگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

جس چیز کو خسرو نے "وصف نگاری" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے وہ حقیقت میں واقعہ نگاری ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ انتخابِ جزئیات اور تفصیلِ کوائف یہ دونوں اجزا وصف نگاری کی جان ہیں اور فارسی میں اس مثنوی سے بڑھکر شاید کہیں موجود ہوں۔

جس وقت ناصر الدین کی فوج کشی کی اطلاع دہلی پہنچتی ہے، سردی کا موسم ہے، کیقباد دار السّلطنت سے شکار کے لیے باہر آتا اور فوج کا معائنہ کرتا ہوا قصر کلوکھری پہنچ جاتا ہے اور وہاں جشنِ شاہی مناتا ہے۔ یہ اس داستان کے ابتدائی واقعات تھے، لیکن یہاں تک پہنچتے ہوئے مثنوی کا پڑھنے والا دار السّلطنت کی سیر کر چکا ہے، اُسے موسم کی پوری کیفیت معلوم ہو چکی ہے، بادشاہ کے جلوس اور شکارگاہ کا نظّارہ دیکھ چکا ہے اور رنگیلے بادشاہ کی محفلِ نشاط کا پورا سین اس کی آنکھوں میں پھر گیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دہلی جمنا کی قریب

واقع ہے اُس میں تین حصار ہیں وہاں پر مسجدِ جامع، منارہ، ماذنہ اور حوضِ شمسی دلچسپ مقامات ہیں اور شہر نہایت آباد اور پُر رونق ہے۔ سردی کے زمانے میں جو خاص تبدیلیاں پیش آتی ہیں وہ سب اُس کے سامنے ہیں اور اس طرح کہ وہ گویا موسم کی کیفیت کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ لمبی راتیں، چھوٹے دن، برف باری اور آگ کی گرم بازاری، گرم اور موٹے کپڑوں کا استعمال، مُنہ سے بھاپ نکلنا وغیرہ یہ سب وہ کیفیات ہیں جنکا خیال آتے ہی جاڑے کا موسم محسوس ہونے لگتا ہے۔ غرض اسی طرح پر ایک ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کا پڑھنے والا کسی ملک کا رہنے والا کیوں نہو وہ واقعات کے ساتھ حالاتِ ماحول اور مناظر کا پورا سماں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوا جاتا ہے۔ اس واقعہ نگاری کی بدولت اُس عہد کے تمدن کی جزئیات پر ایسی روشنی پڑتی ہے جو دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔ دربار، جلوس، مجلسِ شاہی اور فوجی نظام کی گویا چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

مناظرِ فطرت کی مصوّری بھی (اگرچہ ایک جُدا اگانہ خصوصیت قرار دی جاسکتی ہے) اسی خصوصیت کے جس سے ہم بحث کر رہے ہیں تحت میں داخل ہے۔ اس میں خسرو کو امتیازِ خاص حاصل ہے اور اس لحاظ سے میرے خیال میں دنیا کے بہت تھوڑے شاعر اُن کے پہلو بہ پہلو ہیں۔ یہ بحث بہت زیادہ تفصیل کی محتاج ہے لیکن یہاں محض اس کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔

مثنوی قران السعدین میں تمام موسموں کی کیفیات اور مختلف اشیا کے اوصاف

ہیں جس کمال کا اظہار کیا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

تیسری خصوصیت جو خسرو کی شاعری کا مابہ الامتیاز ہے اور جو مثنوی نگاری کی جان ہے وہ نفسانیات کا صحیح ادراک ہے۔ جس طرح ایک ڈراما نگار یا ناول نویس کے لیے ضرورت ہے کہ وہ اشخاصِ قصہ کی شخصیتیں قایم کرے انھیں شروع سے اخیر تک برقرار رکھے، اور حالات و واقعات سے ہر موقع پر ان کی داخلی کیفیات مترشح ہوتی اور اُن کو ایک دوسرے سے متاثر کرتی ہوں، اسی طرح مثنوی نگاری میں جہاں موقع پیش آئے یہ حفظ و تفریق اشخاص لابدّ ہے اس کے بغیر مثنوی میں روح پیدا نہیں ہو سکتی فارسی لٹریچر میں بہت کم مثنویاں ہیں جو اس معیار پر پوری اُترتی ہیں۔

خسرو کو تاریخی مثنویوں میں اس خصوصیت کے پورا کرنے کے لیے یہ موقع حاصل تھا کہ اشخاصِ قصہ اُن کے پیشِ نظر تھے اور وہ ان کو نہایت اچھی طرح جانتے تھے، لیکن اس سے اگرچہ یہ فائدہ ہوا کہ انھیں تخیل کی مدد سے اشخاصِ قصہ کو پیدا کرنا نہیں پڑا جیسا کہ افسانی میں کرنا پڑتا ہے، لیکن تحفظِ شخصیّت کوئی سہل کام نہیں ہے، اور جب تک ادراکِ نفسانیات کے ساتھ شاعر کی قوتِ مصوّرہ نہایت تیز نہ ہو یہ میدان پے سپر نہیں ہو سکتا۔

دوسری اور تیسری خصوصیت دراصل "واقعیت" کے دو پہلو ہیں، خارجی اور داخلی۔ خارجی حالات کا احساس اور ادراک بہ نسبت نفسِ انسان کے پیچیدہ اور مخفی کیفیات کے بہت زیادہ سہل ہے، لیکن جس طرح کسی شخص کی صورت دیکھ لینا اس کو واقعی طور پر جان لینے کے لیے کافی نہیں ہے اسی طرح کسی قصّہ یا داستان میں محض باہر کی اور اوپری چیزیں اشخاصِ قصّہ

سے حقیقی واقفیت کے لیے کافی نہیں۔

قصہ کا پڑھنے والا کتاب ختم کرنے کے بعد قدرتاً یہ خیال کرتا ہے کہ اشخاصِ قصہ کس حد تک اس کے ذہن میں مرتسم ہیں اور وہ اُن کے باطنی حالات، اخلاق و عادات اور رجحانات اور خیالات سے کس حد تک آگاہ ہے۔ مصوّر اور شاعر میں ایک بڑا فرق ہے کہ اوّل الذکر تمامتر خارجی اور محسوس مناظر سے باطنی کیفیات کی جھلک دکھاتا ہے، برخلاف اس کے شاعر بیشتر داخلی پہلو کو لے کر چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی ہستیاں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

واقعیت کے دونوں پہلو کو ملحوظ رکھنا اور اُن کو کامیابی کے ساتھ شاعرانہ نقاشی میں کام میں لانا چنداں آسان نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خسرو شاعری کی اس دشواری سے خوب واقف تھے۔

ایک جگہ قران السعدین میں لکھتے ہیں۔

ایں سخنِ چند کہ بیخو است ست — شاعری نیست کہ ہم راست ست

گرچہ چنیں راست نباید نہفت — "راست بسے ہست کہ نتوانش گفت"

اگرچہ قران السعدین میں اشخاصِ قصہ کی تعداد نہایت ہی قلیل ہے، کیقباد، محمود اور چند دیگر اشخاص لیکن حفظِ شخصیات کا اس میں پورا التزام ہے۔ اس کا پورا لطف اس موقع پر آتا ہے جہاں باپ اور بیٹے کے مابین نامہ و پیام ہوتے ہیں اور اس کے بعد صلح ہو کر خلوت میں ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ یہاں گویا ڈراما کی (جس میں شخصیت کا کامل التزام ہوتا ہے)

جھلک نظر آنے لگتی ہے۔

اس مثنوی میں مرکزی شخصیت کیقباد ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ایک نوجوان بادشاہ تھا جو تمام تر عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ خسرو نے اگرچہ ایک مورّخ کی طرح عیب جو ئی کے نقطۂ نظر سے یہ نہیں کہا کہ بادشاہ ہوا و ہوس میں گرفتار را اور دنیا و ما فیہا سے بے خبر تھا، لیکن ساری مثنوی عشرت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی اور سراپا مرقعِ عیش بنی ہوئی ہے۔

جیسا کہ مولانا اسمٰعیل نے لکھا ہے "حضرت خسرو کو ممدوح بھی خوش قسمتی سے ایسا ہاتھ لگا ہے کہ ساقی و مغنّی و شاہد و بادہ و ساغر کا ذکر محتاجِ تکلف نہیں بلکہ اس کی بزم عیش کا ایک معمولی ہنگامہ ہے"۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ خسرو کی تمام تصانیف بالخصوص مثنویوں کو اس عہد کا آئینہ کہا جا سکتا ہے جس میں وہ لکھی گئی ہیں۔ ایک سچے شاعر کا قلب کیفیات دائرہ اور حالات ماحول سے بہ نسبت دوسروں کے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کے جذبات جلد مشتعل ہوتے اور معرضِ اظہار میں آ جاتے ہیں۔ عہد علائی کی مثنویوں میں اُس عظیم الشان عہد کی ہر جگہ پر جھلک پڑتی ہے۔ اِسی طرح نہ سپہر میں علاء الدین کے عیش پرست جانشین قطب الدین مبارک شاہ کی تفریح صید افگنی اور بزم آرائیوں کا فوٹو سامنے آجاتا ہے جو خلجیوں کی بربادی کی اِسی طرح پیشینگوئی کرتا ہے جس طرح کیقباد کی عیاشیاں سلاطین غلامان کے خاندان کی تباہی کا پتہ دیتی ہیں۔

اِسی خصوصیت کے تحت میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ غزلیات داخل ہیں

جو قران السعدین میں مختلف مقامات پر تضمین کی گئی ہیں۔ ان غزلوں کی خاص خوبی یہ ہی کہ سب حسبِ حال ہیں۔ جس داستان کے بعد آتی ہیں داخلی حیثیت سے پچھلے واقعات کا اعادہ کرتی اور اگلی داستان کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

مثلاً موسمِ سرما ہی کیقباد لشکر کی تیاری کا حکم دیتا ہی:۔

شد ہوا سرد کنوں آتش و خرگاہ کجاست (صفحہ ۴۷)

مقطع میں اگلی داستان "جنبشِ شاہ زدہلی زپے کینِ پدر" کی طرف ایک لطیف اشارہ ہی، جس کا مصرعۂ اولی ساری داستان کا خلاصہ ہی ؎

عزم حج دار د خسرو نرپے توبۂ عشق
توشہ اینک غمِ دل، بارگہِ شاہ کجاست (صفحہ ۴۸)

بادشاہ دارالسلطنت سے روانہ ہو کر عازمِ شہر ہوا ہی۔

"سوارِ چابک من باز عزمِ لشکری دارد" (صفحہ ۵۷)

موسم بہار آتا ہی بادشاہ گل و بلبل کے ساتھ دادِ طرب گستری دیتا ہی ؎

(۱) آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش الخ (صفحہ ۷۲)

(۲) گل امروز آخریں شب مست خاست الخ (صفحہ ۸۶)

(۳) دوش ناگہ بمنِ دل شدہ آں مہ برسید الخ (صفحہ ۹۰)

لشکرِ شاہی فتحمند واپس آتا اور مغل قیدی پیمال ہوتے ہیں۔

تیغ برگیر تا زِ سر برھم
تیر بکشاے کز نظر برھم (صفحہ ۹۹)

باپ بیٹے میں صلح ہو کر ملاقات کی سلسلہ جنبانی ہوتی ہے۔

بباغ سایۂ بیدست و آب در سایہ
از یں سپس من و جانان و خواب در سایہ (صفحہ ۱۳۶)

باپ بیٹے میں ملاقات ہوتی ہے۔

خرم آں لحظہ کہ مشتاق بیارے برسد
آرزو مندِ نگارے بہ نگارے برسد (صفحہ ۱۵۲)

وقتِ وداع ہے باپ اور بیٹا جدا ہوتے ہیں۔

آرامِ جانم می رود۔ دل راصبوری چوں بود الخ (صفحہ ۲۱۰)

مفارقت کے بعد کی بیقراری اور یاد۔

سخت دشوارست تنہا ماندن از دلدار خویش
با کہ گویم حالِ تنہا ماندنِ دشوار خویش (صفحہ ۲۱۶)

بادشاہ عازمِ دار السّلطنت ہوتا ہے۔

باز ابر تیرہ از ہر سوے سر بر می کند الخ (صفحہ ۲۳۰)

بادشاہ دار السلطنت پہونچتا ہے۔

عمر نو گشتہ مرا باز کہ جاں باز آمد الخ (صفحہ ۲۳۴)

کتاب ختم ہو گئی بادشاہ کی خدمت میں شرفِ قبول کی درخواست ہے۔

نامہ تمام گشت بجاناں کہ می برد پیغامِ کالبد بسوے جاں کہ می برد (صفحہ ۲۵۵)

الغرض مسلسل تمام داستان کی کیفیات جو واقعات کے لحاظ سے شاعر کے قلب پر وارد ہوسکتی ہیں، ان غزلیات کے ذریعہ بیان کردی گئی ہیں۔ گویا شاعر نے مجرّد جذبات کے لباس میں تمام قصّہ ہی کو بیان کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس چیز پر لفظ شاعری کا سب سے زیادہ اطلاق ہوسکتا ہے وہ صنف غزل ہے۔ مل نے کیا خوب کہا ہے کہ شاعر کے بیان کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ وہ جذبات میں سرشار دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر نواسنج ہوتا ہے اور اس کا بیان دوسروں کی طرف خطاب نہیں ہوتا، وہ غم و غصّہ شوق و مسرّت سے بیتاب ہو کر ترنّم کرتا ہے۔ جس طرح بلبل اپنے چہچہوں میں خود منہمک اور صحنِ باغ کے بسمل اور وارفتہ سامعین سے بے خبر ہوتی ہے اسی طرح شاعر اپنے جذبات اور واردات قلبی کا اس طرح اظہار کرتا ہے کہ گویا وہ سامعین سے بے نیاز اور بے خبر ہے۔

اِس معیار کو پیشِ نظر رکھو اور قران السّعدین کی غزلیات کو جانچو۔ یہ غزلیات جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں مناسبِ موقع لکھی گئی ہیں گویا خارجی واقعات کو مجرّد جذبات کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

شاعری کی صنف غزل میں خسرو کو جو امتیازِ خاص اور قبولِ خاطر حاصل ہے محتاجِ بیان نہیں۔ وہ غزلسرائی میں سعدی کے متبع ہیں لیکن ان کا غزلیات میں ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے۔ سعدی کے سامنے رکھنے سے معلوم ہو گا کہ کلام کی سلاست اور شیرینی اور جذبات کی پاکیزگی دونوں کے یہاں موجود ہے لیکن خسرو کی غزلیات میں جو طرفگی،

تخیّل، واقعیت، سوز، رقت اور رقص پایا جاتا ہے وہ ہمیں کہیں نہیں ملتا۔ قران السعدین کی غزلیات وسط الحیوٰۃ کے اخیر زمانہ اور غرۃ الکمال کے ابتدائی ایام سے تعلق رکھتی ہیں یہ اُن کے انبساط اور جوش کا زمانہ ہے۔ قران السّعدین کی غزلیات کے متعلق خود خسرو نے کیسی سچی تعریف کی ہے۔

ہر غزلے دشنۂ عشاق کُش (صفحہ ۲۳۶)

جیسا کہ مولانا اسمٰعیل نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے یہ غزلیں حالیہ ہیں۔ علاوہ ازیں مثنوی کی بحر ظاہر ہے کہ شروع سے اخیر تک ایک ہے۔ بیچ بیچ میں مختلف بحروں کی غزلیات شامل ہو جانے سے ایک خاص قسم کا تنوع پیدا ہو گیا ہے، جس سے "تازہ بتازہ نو بنو" کی لذت حاصل ہوتی ہے۔

خسرو کی مثنوی نگاری کی چوتھی خصوصیت جدّت اختراع اور طرفہ آفرینی ہے اُن کی طبیعت کا سب سے زیادہ میلان ایجاد کی طرف تھا۔ ہر صنف میں اس کے شواہد موجود ہیں جیسا کہ اُنھوں نے خود بیان کیا ہے اُن کی نثر تمام تر اُن کی جدت آفرینی کا نتیجہ ہے[۱]۔ رباعیات و قطعات میں وہ کسی کے مقلد نہیں[۲]۔ قصائد، مثنوی اور غزل میں وہ اپنے آپ کو دوسروں کا پیرو بتاتے ہیں، لیکن اس تقلید میں بھی اُنھوں نے اپنی حریتِ ذہنی اور اختراعات کے لیے پورا میدان پیدا کر لیا ہے۔ صنایع اور بدایع میں اُن کی جدّت پسند طبیعت نے ایجادات کے انبار لگا دیئے ہیں[۳]۔

[۱] دیکھو اعجازِ خسروی [۲] دیکھو دیباچہ غرۃ الکمال [۳] دیکھو اعجازِ خسروی دیباچہ تحفۃ الصغر دیباچہ وسط الحیوٰۃ اور دیباچہ غرّۃ الکمال وغیرہ ۱۲

مثنوی قران السعدین میں جو خود جدّت کا نمونہ ہے وہ فرماتے ہیں۔

چند کهم بود بدل این خیال | تازه کنم هر صفتے را جمال
بود در اندیشهٔ من چند گاه | کز دلِ دانندهٔ حکمت پناه
چند صفت گویم و آلش دہم | مجمعِ اوصاف خطالش دہم
طرزِ سخن را روشِ نو دہم | سکّهٔ این ملک بجنس دہم
نو کنم اندازِ رسمِ کہن | پس روئے پیشِ روانِ کہن (صفحہ ۲۳۷-۲۳۸)

آنچه ز سر جوشِ دلِ نقشبند | ق | معنیِ نو بود خیالِ بلند
موئے بمو پیش به ہنر بیختم | پخته و سنجیده در و ریختم
وصف نه زاں گونه شدا ز دل برون | کاں دیگرے را بدل آید که چون
ہر صفتے را که بر انگیختم | شعبدهٔ تازه در و ریختم
نیست ز کس لولوے لالاے من | ثروت به بین رتبهٔ دریاے من
نکتهٔ من گوهرِ کانِ من ست | زانِ کسے نیست از آنِ من ست
دُزد نیم خانه بُرِ دیگرے | خانه کشاده ز درِ دیگرے
مایهٔ ہر دُزد که در عالم ست | گرچه فزون ست بقیمت کم ست (صفحہ ۲۳۸-۲۳۹)

آن که شناسندهٔ این گوهر ست | گر ہمه نفریں کندم در خور ست

نشنوم از خود کنم آفریں (صفحہ ۲۴۲)   داں کہ بہ تقلید نشست اندریں

حقیقت یہ ہی کہ یوں تو انسان کی تمام ذہنی قوتیں وہبی ہوتی ہیں اور کوشش سے اُن میں صرف محدود ترقی ہو سکتی ہی، لیکن غالبًا قوائے دماغی میں سب سے زیادہ غیر اکتسابی وہ قوت ہی جسے "تخیّل" کہتے ہیں اور جو شاعری کے لیے خاص طور پر بمنزلۂ روح و روا ہی۔ شاعر اسے ماں کے پیٹ سے لیکر آتا اور اُسی طرح اپنے ساتھ لے جاتا ہی۔ دوسرے لحاظ سے ممکن ہی کہ اس کے کلام میں روز بروز ترقی ہوتی جائے۔ مثلاً اس کے الفاظ زیادہ شستہ اور بندشیں زیادہ چست ہو جائیں لیکن تخیّل کی مقدار تقریبًا ہمیشہ معیّن رہتی ہی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بڑے شاعر کے کلام میں عہدِ طفولیت میں پیرانہ پختگی اور عہدِ پیری میں طفلانہ تازگی پائی جاتی ہی۔

خسرو کے کلام پر ایک غائر تاریخی نظر ڈالنے سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہی خوش قسمتی سے اُن کا تمام کلام ہر ہر دور کا جُدا جُدا محفوظ ہی۔ بڑی مثنویوں میں قران السعدین پہلی مثنوی ہی لیکن چند چھوٹی مثنویاں بھی جو اُنھوں نے اس سے پہلے لکھی تھیں محفوظ ہیں۔ ذیل میں ہم اُن کی دو ابتدائی مثنویوں سے ایک ہی مضمون کے متعلق انتخابات پیش کر کے قران السعدین سے مقابلہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ ابتدا ہی سے خسرو کے تخیّل کی کیا حالت تھی۔

مضمون مغلون کی ہجو ہے جس میں خسرو نے قران السعدین میں بڑا زورِ قلم دکھایا ہی (دیکھو صفحہ ۹۳-۹۵) یہ مثنوی اُن کے مربّی سلطان محمّد کی شہادت اور خود امیر کے

مغلوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو جانے کے کوئی چار پانچ برس بعد کی ہے۔ اس کے لکھتے وقت اُن کا غم و غصہ جس قدر جوش میں ہوگا ظاہر ہے۔ دوسری مثنوی ۶۸۲ھ یعنی قران السعدین سے کوئی چھ برس پہلے اور حوادثِ مذکورۂ بالا سے ایک سال قبل کی تصنیف ہے۔ تیسری مثنوی سلطان محمدؒ کی ملازمت اختیار کرتے وقت غالباً دوسری مثنوی سے تین چار برس پہلے کی ہے۔

قران السعدین (۶۸۸ھ)	مثنوی (۱۱ر رمضان ۶۸۲ھ)	مثنوی (جو غالباً سلطان محمدؒ کی ملازمت اختیار کرتے وقت لکھی تھی)
کافرِ تاتار بروں از ہزار	در تگاپو چوں سگِ لقمہ ربا	قومے ہمہ گربہ چشم سگسار
کردہ دگر گونہ باشتر سوار	آفتِ نان و بلائے شور ربا	چوں گرگ درندہ آدمی خوار
سخت سرانے بوغا سخت کوش	ہر نانے گر ہمہ باشند سیر	ہمہ بوزنہ وار نا و فا جوے
ہر ہمہ پولادتن و پنبہ پوش	سرنگوں افتند از بالا بزیر	ہم پوست سگے کشیدہ بر روے
اصل ز سگ لیک بزرگ استخوان		چوں سگ ہمہ در دوال مانده
گربۂ سیخی شدہ بر رفتہ خواں		چوں بوزنہ در جوال مانده
		تا چند رہ سگی سپردن
		یا بوزنہ را انگشت بردن
	دو گلہ بر۔ لیک[۱] بر پشت دگل	مشتے دگلاں دو گلہ پوشاں
	گندگی را جاے کردہ در بغل	قربو قربو زناں و جوشاں

[۱] یہ لفظ نسخۂ [illegible] میں [illegible] ہے ۱۲

پوستیں پوشیدہ وبے پوست ہے
درگریز از غازیانِ دوست ہے

گشت پلے گو ہمہ بربانگِ نَے
ہمچو زناں نوحہ کناں پے بہ پے

نالۂ ناخوش ہمی در داشتہ
مست و آوازِ پلے برداشتہ

گویاں سخنے بہ بانگ نے بانی
لافش نہ بزرگ استخوانی

زیں پلہ گردانِ نافرخندہ پے
جاں پلہ کردہ باآوازِ پلے

سر تراشیدہ ز ہمسرِ قلم
زاں قلم انگیختہ خذلاں رقم

بستہ پرِ بوم را بالائے سر
سر تراشیدہ چو بیضہ زیر پر

از سنگ و سیش خراش خوردہ
ہم از سرِ خود تراش کردہ

مشتے پرِ بوم کردہ در سر
بسیار ز بوم شوم روتر

رخنہ شدہ طشتِ مس از چشمِ تنگ
دیدہ در انداختہ در رخنہ سنگ

چشم شاں در روئے ناپیدا شدہ
ہر کہ دیدہ روئے شاں شیدا شدہ

چوں شیشۂ دو چشمِ ازرق و تنگ
در سختی اگر صفت کنم سنگ

دیدہ ہائے در شدہ اندر مغاک
گوئی نشستہ ہست اندر گردہ ہاک

از رخ تا رخ شدہ بینی پہن
وز کلہ تا کلہ لب لب دہن

بینی پست و خیشش ازوی دوال
ہمچو غوکے بر سرِ آبے رواں

بینی پر رخنہ چو گورِ خراب
یا چو تنورے کہ ز طوفانِ آب

موئے زبنی شدہ برلب فراز — ریش نے در روئے شان حملہ زنخ — یک مونہ بریش تا بخندند
سبلتِ شان گشتہ بغایت دراز — آمدہ بہرِ زدن از کوہ و شخ — گوئی کہ یگان یگان بکنند
ریش نہ پیرامنِ چاہِ زنخ — گر نہادہ سبلتانِ کندہ را — سبلت عیان و ریش کندہ
سبزہ کجا بردمد از روئے تخ — دام دادہ ریشِ اہلِ خندہ را — مخصوص برائے ریش خندہ
کرد زنخ شان زمحاسن کنار
اہلِ زنخ را بمحاسن چہ کار
سبلتِ چون سیخ چو تماج روئے
رشتہ ہمین نعمتِ شان درگلوئے

زشت تر از زنگ شدہ بوئی شان — چہرۂ شان اسپرِ غوری پہن
پست تر از پشت شدہ روئی شان — ہم بہ پہنائے سپر دورِ دہن
چہرۂ شان دبۂ نم یافتہ
جائے بجا کنجلک و خم یافتہ

روئے چو آتش کلہ از پشم میش — روئے ہمچون آتش و سر ہمچو دیگ — تفسیدہ زخشم ہمچو تابہ
آتشِ سوزان شدہ با پشم خویش — ماندہ از مردار خواران دو دیگ — رخِ سرخ چو پشتِ آفتابہ
آتش ردیانِ سرد چون آب
سوزان و جہان چو کرم شبتاب
رو سرخ و حدیثِ زشت در کام
چون طشت کہ آن بفتد از بام

خوردہ سگ و خوک بدندانِ بد	رو ترش چوں سرکہ تتماج شوے
ہر ہمہ دندانِ خرد بے خرد	وز ترش خوئی ہمہ تتماج ردے

(صفحہ ۶۳-۶۵)

موش خوارانِ دوندہ موش وار
گشتہ صحرائے زرمشتے موش خوار

مائدہ شاں از خورشِ زشت قے	ہر کہ با ایشاں معاذ اللہ نشست	گندہ دہنان و گندگی دوست
واں کہ ببیند قیش آید بہ پے	قے کند در ساعتے از بوئے زشت	خوکی و سگی کشیدہ در پوست

تینوں جگہ ایک ہی قوم کی ہجو ہے۔ شاعرانہ تخیّل نے ایک نفرت انگیز تصویر کے خط و خال ہر جگہ یکساں طور پر کھینچے ہیں۔ جس طرح ایک ظریف مصوّر کسی شخص کی مضحکہ انگیز تصویر بناتے وقت اُس شخص کی مشابہتِ تامّہ قایم رکھتا ہے، اسی طرح ایک باکمال شاعر محبّت و نفرت کے جذبات سے متاثر ہو کر جو تصویر پیش کرتا ہے وہ اصلیت سے متغائر نہیں ہوتی البتہ اس کے وارداتِ قلبی کے لحاظ سے یہ تصویر کبھی دلکش اور کبھی نفرت انگیز ہوتی ہے۔

خسرو نے مغلوں کی تصویر جس طرح کھینچی ہے اس سے شاعر کی انتہائی دلی نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ اُن کی جن جن چیزوں کو استہزا کے لیے منتخب کیا ہے وہ واقعی ہیں محض قیاسی نہیں ہیں اور اُن جزئیات کو ملا کر جو اس غرض کے لیے انتخاب کی گئی ہیں ہمارے ذہن میں مُغلوں کی ایک ایسی تصویر پیدا ہو جاتی ہے جو جذبات کا حجاب اُٹھا دینے کے بعد بھی مغلوں کی واقعی ہیئت سے مشابہت تامّہ رکھتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھیں، چپٹی ناک، پھیلے نتھنے، چوڑا تمتماتا چہرہ، ڈاڑھی کے دو چار بال

ٹھوڑی سے لٹکے ہوئے، لمبی لمبی موچھیں، گھٹا سر، کلہ پشم سر پر رکھے، پر بوم بطور کلغی لگائے، دگلہ پہنے، نے بجاتے اور تاتاری زبان میں نعرے لگاتے، غرض یہ ساری باتیں واقعی ہیں البتہ شاعر نے ان سب کو اس طرح بیان کیا ہی کہ پڑھکر ان کی رشیخند کے لیے خواہ مخواہ ہر ایک کی طبیعت چاہتی ہی۔

سب سے اخیر میں ہم جس خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ "تناسب" ہی فنونِ لطیفہ میں (جس کے اندر شاعری بھی داخل ہی) "حسن" سب سے زیادہ تناسب کا نتیجہ ہوتا ہی۔ جس طرح "تاج گنج" یا "الحمرا" کی دلکشی کا اندازہ محض ان کی پیمایشیں دیکھنے سے نہیں ہو سکتا بلکہ اُن کے حسن کا تصور نظارے کے ایک مجموعی اثر کا ماحصل ہوتا ہی، اسی طرح کسی کتاب کے تناسب کا خیال کتاب کے مجموعی اثر پر موقوف ہی۔ یہ تناسب ایک طرف الفاظ کی موزونیت سے شروع ہوتا اور دوسری طرف خیالات کی مناسبت اور تمام اجزاے کتاب کی انفرادی اور اجتماعی خارجی اور داخلی موزونیت پر ختم ہوتا ہی۔ مصوّر اور نقّاش تصویر یا نقوش بناتے وقت ایک طرف ہر ہر خط اور ہر ہر جزو کی موزونیت اور دوسری طرف اجزا کی باہمی تناسب کا خیال رکھتا ہی۔ بت تراش مجسّمہ تیار کرتے وقت چوٹی سے ایڑی تک پتھر کے ہر ہر مقام پر نظر رکھتا اور تمام حصص میں توازن و تناسب قایم کرتا ہی۔ معمار عمارت کی ہر ہر اینٹ موزونیت کے ساتھ رکھتا اور تمام عمارات کے حصّوں میں ایک مجموعی مناسبت قایم کرتا ہی۔ موسیقی کا ماہر ایک ایک سُر کو تول کر نکالتا اور نغمے کے مختلف اجزا میں پستی و بلندی قایم کر کے ایک مجموعی موزونیت پیدا کرتا ہی۔ اسی طرح

ادب کے شعبہاے لطیفہ میں مصنف اپنی کتاب کے ہر ہر لفظ اور ہر ہر خیال کو تولتا اور کتاب کے تمام اجزا میں توازن و تناسب پیدا کرتا ہی۔ کتاب کا حُسن اسی تناسب کا نتیجہ ہی اور اسی تناسب میں فرق آجانے سے کتاب کے حُسن میں بھی فرق آجاتا ہی۔

مثنوی میں اس حُسن کا قایم رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہی۔ شاعری کے جملہ اصناف میں یہی صنف ایسی ہی جس میں ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن جسقدر اس کا میدان وسیع ہی اُسی قدر اس کی مرحلہ پیمائی دشوار ہی۔ ہر قسم کے خیالات، جذبات اور واقعات پر قلم اُٹھانا پڑتا ہی اور شاعری کی تمام خصوصیات اور محاسن اس کی تکمیل اور آرایش میں صرف کرنے پڑتے ہیں۔ شاعری کا جو کمال ہومر اور شکسپیر کے یہاں نظر آتا ہی اُس کا عکس ہماری شاعری میں سب سے زیادہ اسی صنف یعنی مثنوی میں ہو سکتا ہی۔ لیکن ذرا غور کرو کہ بے شمار مثنوی نگاروں میں کتنے ہیں جو اس معیار پر پورے اُترتے اور فردوسی و نظامی اور خسرو کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

اگرچہ ہمارا یہ کہنا کسی دوسرے کے لیے بُرہان نہیں ہو سکتا کہ خسرو کی طبعزاد مثنویاں تناسب کے معیار پر پوری اُترتی اور ہمارے ذہن میں حُسن کا تصوّر پیدا کرتی ہیں، لیکن ہمیں یقین ہی کہ مذاقِ سلیم اور وجدانِ صحیح اس کتاب کے پڑھنے والوں کو خود اس نتیجہ کی طرف راہبری کریگا۔ ناظرین اس مثنوی کے پڑھتے وقت ان خیالات کو پیشِ نظر رکھیں اور خود اندازہ کریں کہ شاعر نے مختلف داستانوں کے باہمی ربط اور مختلف اجزا کے باہمی تناسب میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہی۔ جو عمارت اس نے ایک ایک لفظ چُنکر بنائی، جو نقش و نگار

اس نے ایک ایک خیال لیکر کھینچے اور جو راگ اس نے ایک ایک حرف جوڑ کر پیدا کیا ہی اُن سے کہاں تک خسرو فنونِ لطیفہ کے بڑے اُستادوں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق قرار پاتا ہی۔

(۳)

قران السّعدین کے بعض نسخوں پر اس مثنوی کا نام "مثنوی در صفتِ دہلی" لکھا ہوا پایا گیا ہی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہی کہ مثنوی مذکور میں خسرو نے جہاں مختلف اشیاء کے "صفات" لکھے ہیں، وہاں دارالسّلطنت اور اُس کی مشہور عمارات وغیرہ کی توصیف بھی کی ہی۔

قران السعدین سے محقّقینِ آثارِ قدیمہ کو کیقباد کے عہد میں دہلی کے متعلق بعض مستند حالات معلوم ہو سکتے ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

دہلی کو اس عہد میں قبّۃ الاسلام کے لقب سے نامزد کیا جاتا تھا ؎

"قبّۂ اسلام شدہ در جہاں
بستۂ او قبّۂ ہفت آسماں" (صفحہ ۲۹)

شہر پہاڑی پر آباد تھا اس کے گرد دو میل تک باغ تھے اور دریاے جمنا اُس کے قریب آبیاری کرتا تھا ؎

شہر نہ بل بحرِ عجائب نما — بحر و مے گشت بکوہ آشنا
زاں بدلِ کوہ گرفتہ قرار — تا کند اقلیم عدو سنگسار (صفحہ ۳۴)

تا بدو فرسنگ بہ پیرامنش   روضۂ باغ و چمن گلشنش
(صفحہ ۳۳)

تا فلک از جون بدو دادہ آب

دجلہ رواں بردہ بغداد آب (صفحہ ۳۳)

دہلی میں اس زمانہ میں تین حصار تھے، دو پرانے، ایک نیا ؎

از سہ حصارش دو جہاں یک مقام

وز دو جہاں یک نفس دہ سلام (صفحہ ۲۸)

(۱) حصنِ برونیش ز عالم بروں   عالمِ بیرونش حصن اندر دل

(۲) حصنِ درونیش تو گوئی مگر   چرخ بزیر ست و حصارش زبر

(۳) گفت حصارِ نو او را سپہر   کاے فلکِ نو کہن دار مہر

ملک ز دروازۂ او فتح باب   سیزدہ دروازہ و صد فتح باب

ہر دم از آں قلعۂ مینو سرشت   قلعۂ فیروزہ شدہ خشت خشت (صفحہ ۲۸-۲۹)

پہلے دو حصار میں ایک جو باہر کی طرف تھا غالباً قدیم دہلی کی شہر پناہ ہی اور حصار اندرونی شہر کا شاہی قلعہ۔ حصارِ نو سے غالباً حصار شہرِ نو واقع کیلوکھری مراد ہی۔ کیلوکھری کا محل وقوع دہلیِ کہنہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پنجال مشرق کی جانب جمنا کے غربی کنارے پر ہی۔ یہیں پر کیقباد نے ایک قصر تعمیر کیا تھا جس کی مفصل کیفیت قران السعدین میں بدیں عنوان لکھی ہی ؎

صفتِ قصرِ نو و شہرِ نو اندر لبِ آب

کہ بود عرصۂ رفرف چو رفِ آن ایوان (صفحہ ۵۴)

ضروری اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

رفت بکیلوکھری و داد عون　　از مددِ دست چو دریاے جون

قصر شد از فرشِ ارجمند　　چون فلک از منزلتِ خود بلند

قصر نگویم کہ بہشتے فراخ　　روفتہ طوبی درِ او را بشاخ

بامِ سفیدش بفلک سودہ سر　　کرد بخورشید سفیدیِ ابر

آئینہ گشتہ زگچِ صاف خشت　　دید درا و صورتِ خود را بہشت

شکلِ ستونش بمقام ستاد　　قصرِ ارم را شدہ ذات العماد

طرفہ عروسے شدہ آراستہ　　آئینہ از آبِ روان خواستہ

جون کز و گشت حبابے عیان　　قصر نمود از تہِ آبِ روان

ہمچو دو آئینہ مقابل زتاب　　آب درو عکس نما او در آب

طاقِ بلندش بفلک گشت جفت　　حاملِ او شد فلک اندر نہفت

کنگرِ طاقش بزبانِ دراز　　پیشِ فلک گفت سخنہای راز

سنگِ سفیدش کہ شدہ بر سپہر　　آمدہ از مہر و شدہ ہم بمہر

یک طرفش آب و دگر سوی باغ　　باغ و لبِ آب زد و سویش بلاغ

شاخ بہر بارگہِ گرد راہ　　جائگہِ بار شدہ بارگاہ

(صفحہ ۵۴-۵۶)

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہی کہ شہرِ نو جمنا کے قریب واقع تھا اور قصرِ نو دریا کے عین کنارے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اور اس کا عکس دریا میں پڑتا تھا۔ نیچے کا حصّہ اینٹوں سے بنا تھا، جس پر چونہ اور سفیدی ہو رہی تھی۔ اوپر کے حصّہ میں سنگِ سفید لگا تھا۔ اس قصر کے ایک طرف جمنا تھی، اور دوسری طرف باغ تھا، جو بارگاہ سے اسقدر قریب تھا کہ درختوں کی شاخیں بارگہ کے اندر داخل ہوتی تھیں۔ ع

جائگہِ بار شدہ بارگاہ

اس مصرع میں لفظ بار میں لطیف ایہام ہی۔ معنی مقصود یہ ہی کہ بارگاہ قربِ باغ کے باعث شاخوں کے داخل ہونے کی وجہ سے پھلوں کے رکھنے کی جگہ ہو گئی ہی۔ معنی قریب جن کی طرف پہلی نظر میں ذہن منتقل ہوتا ہی یہ ہیں کہ "بارگاہ" دربار کی جگہ ہی۔ غرّۃ الکمال میں بھی قصرِ معزی کی تعریف میں ایک چھوٹی سی مثنوی ہی جس کے چند اشعار درج ذیل کیے جاتے ہیں ؎

زہے فرخندہ قصرِ آسماں سائے	کہ ہست از رفعتش بر آسماں جائے
بروئے آب فردوسِ جہاں تاب	کجا فردوس خود باشد برین آب
بآبِ جون دادہ صنعت دلون	زمیں پوشیدہ در پیشش لبِ جون
خیالِ قصر کاندر آب زد تاب	فلک را سرنگوں افگند در آب
نظیرے این چنیں قصری محالست	مگر در آب بینی واں خیال ست
زمینش مہ بلندی آسماں گیر	مبارک باد بر شاہِ جہاں گیر

معزالدین کہ دنیا را بیاراست | زنامش دین و دنیا را بیاراست
شہنشاہ کیقباد آں افسرِ ملک | کہ چوں افسر برآمد بر سرِ ملک
خدا دادت در ایّامِ جوانی | بہیں ملکے چو ملکِ جاودانی

بعض گزشتہ اور موجودہ مورّخین نے "شہرِ نو" کی تعمیر کو بھی غلطی سے معزالدین کیقباد کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ "شہرِ نو" اس نام سے کیلوکھری میں پہلے ہی سے آباد تھا۔ چنانچہ جلوسِ ناصری کے پندرھویں برس ۶۵۸ھ میں جس وقت ہلاکو خاں کے سفیر ناصر الدین محمود کے دربار میں پیش ہوئے اُس وقت (بقول صاحب طبقاتِ ناصری جس نے یہ حالات چشم دید بیان کئے ہیں) دو لاکھ پیادہ اور پچاس ہزار سوار اور اہالیانِ دہلی کی بیس بیس صفیں دو طرفہ "شہرِ نو" واقع کیلوکھری سے لیکر قصرِ شاہی واقع دہلی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سفرا شہرِ نو سے جانب دار السلطنت روانہ ہوئے۔

"بقدرِ دو لک پیادہ تمام بحضرت آمد، و بقدرِ پنجاہ ہزار سوار آمادہ برگستوان و بیرق و تعبیہ ساختہ و خلق و عوامِ شہر از معارف و اوساط و ارذال چنداں مرد از سوار و پیادہ بیروں رفت کہ از "شہرِ نو" کیلوکھری تا درونِ شہر کہ قصرِ سلطنت بود بیست صفِ مرد پُشت بہ پُشت چوں باغ فراہم یافتہ کتف بر کتف نہادہ صف در صف ایستادہ ..... چوں رُسلِ ترکستاں از دو "شہرِ نو" برنشستند الخ"

اِس کا بہترین ثبوت کہ شہرِ نو کی بنیاد کیقباد نے نہیں ڈالی خود خسرو کے بیان سے

مترشح ہے۔ "در صفتِ قصرِ نو و شہرِ نو اندر لبِ آب" میں اُنھوں نے صرف قصر کی تعریف کی ہے اور اسی کو کیقباد کی طرف منسوب کیا ہے۔ "شہرِ نو" کے متعلق کچھ نہیں لکھا حالانکہ یہ امر بیّن ہے کہ اگر شہرِ نو میں قصر کے علاوہ کوئی حصّہ معزالدین کا تعمیر کیا ہوا ہوتا تو اس کا ذکر وہ ضرور کرتے۔ علاوہ ازیں کیقباد ۶۸۶ھ میں تخت پر بیٹھا اور اگر یہ مان لیا جائے کہ اُس کا جلوس اوائل سال میں وقوع میں آیا (اور قرائن کا یہی تقاضا ہے) تو ذوالحجہ ۶۸۶ھ تک جبکہ بادشاہ دار السّلطنت سے روانہ ہو کر کیلوکھری قصر معزی کو گیا ہے کسی طرح نیا شہر بننا قیاس میں نہیں آسکتا۔ اسقدر قلیل مدّت صرف ایک عالی شان محل کی تعمیر کے لیے کافی ہے۔

قصر کی تعمیر کے بعد کیقباد کا اس کو اپنا دار السّلطنت قرار دینے لینا خود ظاہر کرتا ہے کہ شہر نو اس کے زمانہ میں اسقدر آباد تھا کہ فوراً دار السّلطنت بنا لینے میں کوئی دقّت نہیں ہوئی چنانچہ جب کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی تخت پر بیٹھا تو اس نے اس مقام کو اپنا دار السّلطنت منتخب کر لینے میں کوئی دقت نہیں دیکھی۔ البتہ اس کے زمانے میں اس شہر کو ترقی حاصل ہوئی۔

دہلی کی عمارات اور آثار میں اس زمانے میں تین چیزیں امتیازِ خاص رکھتی تھیں مسجد جامع، منارۂ ماذنہ، اور حوضِ سلطانی۔ خسرو نے اور بھی جہاں کہیں دار السلطنت کی یاد کی ہے انھیں تین چیزوں کو خصوصیت کے ساتھ شمار کیا ہے[۱]

[۱] مثلاً دیکھو مثنوی تحفۃ و خط غرۃ الکمال بنام تاج الدین زاہد از آورده ۱۲

مسجد جامع کے متعلق حسبِ ذیل اشعار قابلِ غور ہیں ؎

غلغلِ تسبیح بگنبد درون | رفتہ زنہ گنبدِ والا برون
گنبدِ او سلسلہ پیوند راز | سلسلہ چوں کعبہ شدہ حلقہ ساز
ورتہ سقفش زسما تا زمیں | نصب شدہ جملہ ستونہائے دیں (صفحہ ۳۰)

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مسجد مذکورہ میں تو گنبد تھے مسجد کی چھت کے نیچے جابجا ستون قایم تھے ؎

ورتہ سقفش زسما تا زمیں | نصب شدہ جملہ ستونہائے دیں

یہ وہی ستون تھے جو مسجد مذکورہ کی تعمیر سے پہلے رائے پتھورا کے مندر میں لگے ہوئے تھے ان میں سے کچھ ستون اس وقت بھی موجود ہیں اور مسجد مذکور کا محل وقوع بتاتے ہیں

منارہ کے متعلق ؎

شکلِ منارہ چو ستونے زسنگ | از پئے سقفِ فلکِ شیشہ رنگ
آں کہ زرز برسرش افسر شدہ است | سنگ زنزدیکیِ خور زر شدہ است
سنگِ وے از بس کہ بخورشید سود | روز بروز خورشید عیارے نمود
سنجر سنگیں کہ ستونِ سپہر | آمدہ از مہر وشدہ ہم بمہر
از پئے بر رفتنِ ہفت آسماں | کرد زمیں تا بفلک نردباں
گرد سرش کرد مؤذن چو گشت | قامتش از مسجدِ عیسیٰ گذشت
مؤذنش آں جا کہ اقامت کشید | قامت مؤذن نتواند رسید (صفحہ ۳۰-۳۱)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منارہ ماذنہ تھا۔

بعض محققینِ آثار کو (جن کی نظر سے غالباً یہ اشعار نہیں گزرے) اس سے انکار ہے۔ لیکن خسرو کا بیان سندِ قطعی ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ کی گنجایش نہیں۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں منارۂ مذکور میں بجلی گرنے سے خلل آگیا تھا اور اُس نے اوپر کے حصّہ میں بہت کچھ اضافہ اور ترمیم کی، لیکن خسرو کے زمانے میں یہ منارہ اصلی حالت میں موجود تھا۔ اور ابن بطوطہ نے بھی ترمیم مذکور سے کچھ ہی دن پہلے محمد تغلق کے عہد میں اس منارہ کو دیکھا تھا۔ خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ منارۂ مذکور کے اوپر چتر (یا قبّہ) بنا ہوا تھا جس کا اوپر کا حصّہ سونے کا تھا۔ ابن بطوطہ کی اس مینار اور چتر کے متعلق حسبِ ذیل عبارت ہے:

"یہ مینار سُرخ پتّھر کا بنا ہوا ہے۔ حالانکہ مسجد سفید پتّھر کی ہے۔ مینار کے پتّھروں پر نقش کندہ ہیں اور اُن کا اوپر کا چتر خالص مرمر کا ہے اور لٹّو زرِ خالص کے ہیں۔"

خسرو اور ابن بطوطہ کے بیانات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ منارۂ مذکور بحالتِ اصلی محض سُرخ پتھر کا تھا جس کے اوپر ایک سنگِ مرمر کا چتر تھا اور چتر کے لٹّو اور کلس (غالباً) سونے کے تھے۔ افسوس ہے کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے خسرو نے کہیں اس کے متعلق کنایۃً بھی ذکر نہیں کیا کہ اُس زمانے میں مینار مذکور کے کتنے درجے تھے۔

حوضِ سُلطانی کے متعلق ۵

در کمرِ سنگ میانِ دو کوہ ۔۔۔ آب گہر صفوت و دریا شکوہ
ساختہ سلطانِ سکندر صفات ۔۔۔ در سدِ کوہ آئینۂ زآبِ حیات
شہر گر از وے نبود آب کش ۔۔۔ کس نخورد در ہمہ شہر آب خوش
در تہِ آبش ز صفا ریگِ خرد ۔۔۔ کور تواند بدلِ شب شمرد
سیلِ وے آہنگ بکہسار کرد ۔۔۔ کوہ تبر دامنے اقرار کرد
چوں مد و جزرش ز نشیب و فراز ۔۔۔ زآب ز کوہ آمدہ و رفتہ باز
چوترہ و قصر بلندش در آب ۔۔۔ گشت ازاں ساغرِ صافی حباب
رود بسے زد شدہ تا آبِ جون ۔۔۔ جوں زپئے آب از دجستہ عون
گرد وے از اہلِ تماشا گروہ ۔۔۔ دامنِ خیمہ شدہ دامانِ کوہ (صفحہ ۳۲-۳۳)

اِن اشعار سے ثابت ہوتا ہی کہ یہ حوض جس کو سلطان التمش نے (۶۲۷ھ ۱۲۲۹ء میں) تعمیر کیا تھا دو پہاڑوں کے بیچ میں واقع تھا اور اس کی موجیں دامان کوہ سے ٹکراتی تھیں یہ تمام شہر کو میٹھا پانی یہیں سے دستیاب ہوتا تھا۔ دریائے جمنا سے اُس حوض تک بہت سے نالے نکالے گئے تھے۔ پانی ایسا صاف شفّاف تھا کہ تہ کی ریگ دکھائی دیتی تھی۔ بیچ حوض میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر ایک عمارت بھی قایم تھی۔ شہر کے لوگ تفریح طبع کے لیے یہاں آتے اور دامنِ کوہ پر خیمہ زن ہوتے تھے۔

علاء الدین کے زمانہ میں اس حوض کی مرمّت ہوئی تھی اور بیچ میں ایک خوشنما گنبد تعمیر کرا دیا گیا تھا۔ قران السعدین کے بیان سے یہ امر ثابت ہوتا ہی کہ اس گنبد سے پہلے

التمش کا چبوترہ موجود تھا۔

اس مثنوی میں خسرو نے علاوہ دہلی کے خاص اُس کے مضافات وحوالی کا بھی ذکر کیا ہے۔

کیقباد اپنے لشکر کے ساتھ دار السلطنت سے روانہ ہو کر سیری میں خیمہ زن ہوا

کوکبۂ زیں نمط انجم شمار — رفت بروں با علمِ شہریار

نصب شد اعلامِ مبارک اصول — گرد سراپردہ بسیری نزول

بارگہِ شاہ دراں بوستاں — رشکِ ظفر داشت بہندوستاں (صفحہ ۵۱)

بارگہِ خاص بسیری رسید — سبزۂ تر بر سرِ سبزی رسید

دائرۂ خیمہ بسیری قطار — ابر فرود آمدہ در مرغزار

بس کہ دراں گلشنِ مینونشاں — شاہ شد از ابرِ کرم دُر فشاں

ہر کہ دریں سبزہ نظر در گرفت — قطرہ طلب کرد و گہر بر گرفت (صفحہ ۵۲)

اِن اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں "سیری" سبزہ زار تھا۔ کوئی تیرہ یا چودہ برس بعد علاء الدین نے حملہ مغل کے وقت دہلی سے نکلکر اسی میدان میں جنگ کی تھی اور فتحمند ہونے پر بطور فالِ نیک اپنے دار السلطنت کے لیے اس موقع کو انتخاب کیا تھا۔ اس کے جانشین کیقباد نے حصار و عماراتِ سیری کی تکمیل کی۔ اور اس کا نام "دار الخلافہ" رکھا۔ یہ حالات مفصّل طور پر امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں لکھے ہیں حوالی شہر میں تلپٹ، اندپٹ اور افغان پور کا بھی ذکر کیا ہے۔

میمنہ بر تلپتہ زد یکسرہ ۔ بود میان اندپتم میسرہ

پیل گراں سنگ بہ بہاپور بود ۔ قلب چو دریاش درآمد بجود

پیش بہاپور بعد رسہ میل ۔ سنگ گراں سر شدہ از پای پیل (صفحہ ۵۲)

لشکر شاہی کا سیدھا بازو تلپت میں، الٹا اندپت میں اور بہاپور میں قلب لشکر تھا۔ اندپت (اندر پت یا اندر پرست) کا محل وقوع دہلی کہنہ سے ساڑھے ۴ میل شمال مشرق کی طرف ہے جہاں فی زمانہ پرانا قلعہ یا قلعۂ دین پناہ ہمایوں بنا ہوا ہے۔

تلپت کا ذکر ابن بطوطہ نے بھی کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "تلپت دہلی سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ہے" اب بھی اس نام کا ایک پرانا گاؤں متھرا کی سڑک کے پاس ضلع دہلی میں دہلی سے کوئی تیرہ میل جنوب مشرق کی طرف واقع ہے۔ اس زمانے کی تاریخوں میں اس کا ذکر کثرت سے پایا جاتا ہے۔ دہلی سے پورب کو آتے جاتے جمنا کو پار کرتے وقت یہ مقام ملتا ہے۔

بہاپور: اس کا محل وقوع خسرو کے بیان سے اس طرح تحقیق ہوتا ہے کہ وہ اندپت اور تلپت کے بیچ میں تھا۔ بدایونی نے دو جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو اس موقع پر جب کیقباد کے مرنے سے پہلے جلال الدین خلجی نے شمس الدین کیکاؤس کو (جسے اہالی دہلی نے تخت نشین کر دیا تھا) بہار پور میں جہاں جلال الدین خود مقیم تھا نظر بند کر لیا۔ اور دوسرے اس موقع پر جب کیقباد کے قتل ہونے کے بعد بہاپور میں کیکاؤس کو تخت نشین کیا گیا۔

"شہر نو" (کلوکھری) روانہ ہو کر بادشاہ نے پہلی منزل حدود تلپت و افغان پور

نقشہ دہلی قدیم مع مضافات بعہد معزالدین کیقباد (۶۸۶-۶۸۹ھ)

ہیں کی ہے

کوچ سپہ کرد شہ از شہرِ نو ... داد جہاں را ز ظفر بہرِ نو

منزلِ اوّل کہ شد از شہر دُور ... بود حد تلپت و افغان پور

یافت سراپردہ در آن جا مقام ... دشت در آمد زرسن ہا بدام (صفحہ ۸۹)

افغان پور کا محل وقوع بدایونی نے تغلق آباد سے تین کوس بیان کیا ہے یہیں پر بنگال سے واپس ہوتے ہوئے محمد تغلق نے اپنے باپ غیاث الدین تغلق کا اُس محل میں استقبال کیا تھا جو غیاث الدین پر گر کر اُس کی موت کا موجب ہوا۔

(دیکھو ابن بطوطہ اور بدایونی)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ افغان پور تغلق آباد سے تین کوس مشرق کی طرف واقع تھا جو جمنا کو عبور کرنے کے بعد تغلق آباد کے راستہ میں پڑتا تھا۔

اِن مضافات کے محلّ وقوع کو سمجھنے کے لیے ہم جداگانہ ایک سرسری خاکہ اُس وقت کی دہلی کا دیتے ہیں۔ (دیکھو نقشہ مقابل صفحہ ہٰذا)

(۴)

قران السّعدین کا سلسلۂ تواریخ و شہور و سنین

خسرو نے قران السّعدین میں کیقباد کی تخت نشینی کا سال ۶۸۶ھ بیان کیا ہے۔ لیکن خلافِ عادت جلوس کا تاریخ اور مہینہ نہیں دیا۔ دوسری مثنویوں مثلاً نہ سپہر، فتح الفتوح تغلق نامہ وغیرہ میں وہ نہ صرف تاریخ اور دن دیتے ہیں بلکہ ساعت اور زائچہ

تک بیان کر دیتے ہیں۔ مثنوی کے واقعات کے متعلق بجز دو مقامات کے اُنھوں نے کہیں پر سنہ نہیں دیا۔ حالانکہ بعض جگہ مہینوں کا ذکر کیا ہے اور ہر جگہ واقعات کے ساتھ موسموں اور فصلوں کی کیفیت بیان کی ہے۔

سال جلوس کے علاوہ جو دوسرا سنہ اُنھوں نے بیان کیا ہے وہ مثنوی کے ختم ہونے کی تاریخ یعنی رمضان ۶۸۶ھ ہے ؎

ساختہ گشت از روشِ خامۂ — از پسِ شش ماہ چنیں نامۂ
در رمضانِ شد بسعادت تمام — یافت قران نامۂ سعدین نام
آنچہ بتاریخ زہجرت گزشت — بود سنۂ شش صد و ہشتاد و ہشت ۶۸۸ (صفحہ ۲۳۰)

دوسرے واقعات کی تاریخ کا سلسلہ اسی تاریخ کے ذریعہ سے اس طرح قائم ہوتا ہے۔

(۱) خسرو نے یہ مثنوی اَوَدھ سے لوٹ کر رمضان ۶۸۶ھ میں چھ مہینے کی محنت کے بعد لکھی۔

(۲) اُن کا دہلی پہنچنا ماہِ ذیقعدہ میں ہوا ؎

ہمچو مہِ عید خوش و شاد بہر
در مہِ ذیقعدہ رسیدم بشہر (صفحہ ۲۲۲)

مثنوی کی تصنیف میں جو چھ مہینے صرف ہوئے اُن کا لحاظ رکھتے ہوئے اس مہینے سے ذو القعدہ ۶۸۷ھ مقصود ہے۔

(۳) بنا بریں باقی مثنوی کے تمام واقعات ذوالقعدہ ۶۸۵ھ اور جلوس کیقباد ۶۸۶ھ کے مابین ہوئے۔

(۴) بادشاہ اخیر ذی الحجہ میں دہلی سے کلوکھری گیا تھا، اور وسط ربیع الاوّل میں لشکر کی روانگی جانبِ اَوَدھ ہوئی تھی۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دار السّلطنت سے کیقباد ذی الحجہ ۶۸۶ھ میں اور لشکر وسط ربیع الاوّل ۶۸۷ھ میں روانہ ہوا۔

(۵) جیساکہ انھوں نے منظوم خط میں بیان کیا ہے دو مہینے کے سفر کے بعد لشکر اَوَدھ پہنچا۔ اس حساب سے لشکر کا پہنچنا وسط جمادی الاولیٰ ۶۸۷ھ میں ہوا یہی مہینہ قران السّعدین کے خاص واقعہ یعنی ملاقات کا سمجھنا چاہیئے۔

قران السعدین میں ملاقات کے طالع و وقت وغیرہ کے بیان میں (دیکھو صفحہ ۱۶۷) حسبِ ذیل شعر بھی درج ہے۔

تیرہ شبے و مہِ گردوں بخواب
ماہِ زمیں منتظرِ آفتاب (صفحہ ۱۶۸)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اخیر جمادی الاولیٰ ۶۸۷ھ میں وقوع میں آیا۔

(۶) میں جلوسِ کیقباد کی تاریخ ۶۸۶ھ کے نصف اوّل میں قرار دیتا ہوں اس لیے کہ ذی الحجہ ۶۸۶ھ سے پہلے قصرِ شاہی کلوکھری میں تعمیر ہو چکا تھا اور ناصر الدین محمود بلبن کی وفات اور کیقباد کی تخت نشینی کی خبر پا کر لکھنوتی (بنگال) سے

چلکر اَوَدھ پر لشکر کشی کرچکا تھا۔ ان واقعات کے لیے میرے خیال میں کئی مہینے درکار ہیں۔

اِس مثنوی میں خود اپنے متعلق امیر خسرو کا بیان غور طلب ہی وہ لکھتے ہیں کہ

دربار معزی میں باریاب ہونے سے پیشتر اَوَدھ میں چھ مہینے رہے ۵

با عَلَمِ فتح دراں راہِ دور	سایہ فشاں شد بسجد کنتپور
خان جہاں حاتمِ مفلس نواز	گشت باقطاعِ اَوَدھ سرفراز
من کہ بُدم چاکرِ او پیش ازاں	کرد کرم زانچہ کہ بد بیش ازاں
در اَوَدھم بردبہ لطفے چناں	کیست کہ از لطف تبادعناں
غربت از احسانش خیالم گزشت	رکم وطن اصل فراموش گشت
در اَوَدھ از بخششِ او تا دو سال	ہیچ غم و نالہ نبود از منال
من زپئے شرمِ خداوندِ خویش	رفتہ زجاے خود و پیوندِ خویش (صفحہ ۲۲۱)

اس بیان سے ظاہرا یہ مترشح ہوتا ہی کہ وہ دو برس تک مسلسل دہلی سے جدا اَوَدھ میں خان جہاں کے ساتھ رہے لیکن یہ قیاس صحیح نہیں ہی۔ اس لیے کہ جیسا کہ اُس منظوم خط سے جس کے اشعار اوپر نقل کیے جا چکے ہیں معلوم ہوگا وہ ربیع الاوّل ۶۸۷ھ میں لشکرِ شاہی کے ہمراہ دہلی سے روانہ ہوئے تھے اور جیسا کہ قران السعدین سے معلوم ہوتا ہی ذی الحجہ ۶۸۷ھ میں دہلی واپس آگئے تھے۔ لشکرِ شاہی دو مہینے کی مسافت کے بعد وسط جمادی الاولیٰ ۶۸۷ھ میں اَوَدھ پہنچا اور جیسا کہ قران السعدین سے معلوم ہوتا ہے

ایک ماہ کے سفر کے بعد خسرو اَودھ سے دہلی واپس ہوئے ؎

یک مہِ کامل بہ کشیدم عناں
راہ چنیں بود و کشش آں چناں (صفحہ ۲۲۲)

اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ جمادی الاولیٰ ۶۸۶ھ ہی میں اَودھ پہنچ گئے تھے اور اخیر شوال ۶۸۷ھ میں وہاں سے واپس روانہ ہوئے تو اُن کے قیام اَودھ کی مدت زیادہ سے زیادہ پانچ مہینے ہوتی ہے۔

اس اختلاف کے رفع کرنے کی صورت حسب ذیل ہے۔

جیسا کہ خسرو نے دیباچۂ غرۃ الکمال میں بیان کیا ہے کیقباد کی تخت نشینی کے وقت اُنھوں نے عزلت نشینی ترک کر کے حاتم خاں خان جہاں کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ جس وقت کیقباد نے اَودھ سے مراجعت کرتے ہوئے خان جہاں کو اقطاع اَودھ حوالہ کئے تو خسرو خان جہاں کے ساتھ سابق تعلق کی بنا پر اَودھ جانے پر مجبور ہو گئے۔

اب اگر یہ مان لیا جائے کہ جلوس معزی اوائل ۶۸۶ھ کے وقت سے خان جہاں اَودھ میں تھا، تو خسرو کا تقریباً دو سال تک اَودھ رہنا ثابت ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ امر مسلّم ہے کہ وہ اخیر دفعہ دہلی واپس آنے سے آٹھ مہینے پہلے دہلی آئے ممکن ہے کہ محض چند روز کے لئے دہلی آئے ہوئے تھے۔

(۵)

خسرو کی اکثر مثنویوں میں حمد و نعت کے بعد اپنے مرشد سلطان المشایخ حضرت شیخ نظام الدینؒ کی تعریف ہوتی ہے۔ خمسہ کی تمام مثنویوں اور عشیقہ اور نہ سپہر میں یہ التزام ہے۔ تغلق نامے کا ابتدائی حصّہ موجود نہیں ہے۔ اُس میں بھی اغلباً مدح شیخ ہوگی۔ خمسہ سے پہلے کی مثنویوں میں البتہ یہ التزام نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ قرآن السّعدین میں شیخ کی مدح موجود نہیں ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ قران السعدین اور اُس سے پہلی مثنویوں کی تصنیف کے وقت خسرو کے تعلّقات شیخ رحمہ اللہ سے پیدا نہیں ہوئے تھے؟

یہ قیاس واقعات کے قطعاً خلاف ہے۔ تحفۃ الصغر میں جو امیر کا پہلا دیوان ہے اور جس میں بیس برس تک کا کلام پایا جاتا ہے، شیخ کی تعریف میں ایک نہایت عمدہ ترکیب بند اور رباعیات اور قطعات موجود ہیں۔ وسط الحیوٰۃ میں بھی مدحِ شیخ میں قصائد وغیرہ ہیں۔

علاوہ اس داخلی سند کے معتبر ترین تاریخی شواہد سے بھی یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ شیخ کے ساتھ امیر خسرو کے تعلقات کی ابتدا عنفوانِ شباب سے ہوئی اس بارے میں سب سے زیادہ قابلِ وثوق بیانات سیر الاولیا کے مصنّف سید محمد مبارک کرمانی (المعروف بہ امیر خورد) کے ہیں جو تقریباً معاصر مورخ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے آباؤ اجداد کے حضرت شیخ اور امیر خسرو کے ساتھ نہایت گہرے مخلصانہ و معتقدانہ تعلقات تھے۔

امیر خورد اپنے باپ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت شیخ نظام الدین حضرت شیخ فرید الدین کے مرید ہو کر دہلی تشریف لائے ہیں وہ امیر خسرو کے نانا راو عرض (عماد الملک) کے مکان میں دو برس تک مقیم رہے (سیر الاولیا صفحہ ۱۰۸)

یہ زمانہ امیر خسرو کی آغازِ شاعری کا تھا۔ جو نظم لکھتے تھے حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے چنانچہ خسرو نے "طرز صفاہانیان" پر غزلسرائی شیخ کی فرمایش سے شروع کی تھی (سیر الاولیا صفحہ ۳۰۱)

الغرض یہ گمان تو صحیح نہیں ہو سکتا کہ اس مثنوی یا اس پہلی مثنویوں میں مدح شیخ کا موجود نہ ہونا عدم تعلقات کا اظہار کرتا ہے لیکن اس فرو گذاشت کی کوئی نہایت قوی وجہ ہمارے سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ خمسہ کا آغاز شیخ کی بشارتِ روحانی سے ہوا تھا (دیکھو مطلع الانوار خلوت سوم) سب سے پہلے منقبت شیخ کا التزام کرنے کا خیال اُسی وقت سے پیدا ہوا اور چونکہ خسرو کا وفورِ عقیدت اور رسوخ روز افزوں ترقی کرتا رہا اس لیے یہ التزام اخیر تک قایم رہا۔

(۶)

مثنوی قران السعدین کا ایک شعر تاریخی دلچسپی رکھتا ہے۔ خسرو نے کشتی کی تعریف میں لکھا ہے ؎

ماہِ نوی کاصلِ وے از سال خاست
گشت یکے ماہ بدہ سال راست (صفحہ ۱۴۵)

کہتے ہیں کہ جس وقت مولنا جامی نے اس شعر کو دیکھا تو انھیں سال اور ماہ کے معنی سمجھنے میں بہت کچھ تردد ہوا۔ بالآخر اُنھوں نے اس شعر کی تفسیر میں ایک رسالہ تصنیف فرمایا اور بحث کا خاتمہ اس پر کیا کہ:-

"چیزے خواستہ کہ بزبانِ ہند مخصوص باشد"

نفائس المآثر کا مصنف کہتا ہی کہ جب سلطان حسین مرزا کے زمانے میں شیخ جمالی دہلوی خراسان گئے تو اُن کی ملاقات مولانا جامی سے بھی ہوئی۔ مولانا نے اس شعر کے معنی شیخ سے دریافت کیے تو شیخ نے کہا کہ "سال" دراصل ایک لکڑی کا نام ہی جس سے ہندوستان میں کشتی بنائی جاتی ہی[1]۔

خسرو نے اور بھی جابجا ہندی الفاظ کا آزادی سے اپنے یہاں استعمال کیا ہی اور اُن سے طرح طرح کے لطایف اور صنایع و بدایع پیدا کیے ہیں بالخصوص اس قسم کے الفاظ سے بکثرت مفید ایہام نکالے ہیں[2]۔

یہ قصہ ہمیں خسرو کی شاعری کی ایک اہم اور سبق آموز خصوصیت یاد دلاتا ہی جس کو یہاں مختصر طور پر بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہی۔

دنیا کے بڑے آدمیوں کے حالات کا مطالعہ کرتے وقت (خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں) یہ دیکھا جاتا ہی کہ کہاں تک وہ اپنے حالات ماحول کا ماحصل تھے اور کس حد تک اُنھوں نے بذاتِ خود گرد و پیش کے حالات پر اثر ڈالا اور

[1] یہ تمام قصہ ہفت آسمان میں لکھا ہی (دیکھو صفحہ ۷۲)۔ [2] مثلاً خزائن الفتوح میں ہندی اسماء اور اعلام کو تحریف سے محفوظ رکھنے کے لیے اس قسم کی پرلطف صنعتوں کا استعمال کیا ہی ۱۲

اُن کو تبدیل کرنے میں حصہ لیا۔ تاریخ جہاں ایک طرف بڑے آدمی بناتی ہو وہاں دوسری طرف بڑے آدمی تاریخ بناتے ہیں۔

خسرو دونوں لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف وہ اس دور کے صحیح نمایندہ ہیں اور دوسری طرف ہندوستان کی تاریخ پر اُن کا گہرا اثر پڑا ہی۔

دنیا کے بڑے آدمی اچھے ستاروں کے اجتماع کے وقت پیدا ہوتے ہیں۔ خسرو نے بھی کسی ایسی ہی گھڑی جنم لیا تھا۔ جس عہد میں پیدا ہوئے اُس کی "ترکیب ثلاثہ" اپنے ساتھ لیے ہوئے آئے اور اُن کی شاعری تمام آبائی، قومی اور ملکی اثرات سے مل کر پیدا ہوئی۔ اُن کے باپ خالص ترک تھے، لیکن اُن کی ماں عماد الملک "راوت" کی بیٹی اور نسلاً ہندی تھیں۔ اُن کے باپ کا سایہ صغر سنی ہی میں اُن کے سر سے اُٹھ گیا اور انھوں نے اپنی ماں کی گود اور نانا کی سرپرستی میں نشو و نما پائی۔ یہی وجہ ہی کہ اُن کی شاعری سراسر ایسے جذبات اور خیالات سے معمور ہی جنھیں وطن اور گھر کے اثرات کے علاوہ ماں کی جانب سے ورثہ طبعی قرار دیا جا سکتا ہی۔ اُنکی آبائی زبان ترکی تھی اور قومی اور علمی زبان فارسی، جو اُس عہد میں ہندوستان کے مسلمانوں میں مشترک زبان کے طور پر بولی اور لکھی جاتی تھی۔ لیکن خسروؒ کی مادری زبان ہندوستانی تھی، جسے وہ اسقدر عزیز رکھتے اور وقتاً فوقتاً اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کا آلہ بناتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کی شاعری بحیثیتِ مجموعی ہندوستان کے اُس دلچسپ دور کا آئینہ ہی جس وقت

ملک کے مختلف عناصر میں امتزاج و اختلاط ہو رہا تھا اور اہلِ ملک کے لیے زبان، جذبات،
اور خیالات کی آمیزش اور موافقت کی شاہراہ تیار ہو رہی تھی۔

ملک کی اس مشترک تہذیب کی ترقی میں خسرو کا خاص حصّہ ہے۔ وہ وطن کی
محبّت کو ایمان سمجھتے تھے اس حق کو انھوں نے خوب ادا کیا ہے اور حب الوطنی کے
جذبات کو ہر طرح مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح خیالات اور زبان کی آمیزش
سے مشترک زبان کی بنیادیں جمانے اور اتحادِ خیالات پیدا کرنے میں جو حصّہ لیا ہے
وہ کسی تفصیل کا محتاج نہیں ہے۔

جو سوت آج سے سات سو برس پہلے پہیلیاں اور گیت ہو کر پھوٹا تھا وہ آج سمندر
ہو گیا ہے اور اس برِ اعظم کی تسخیر کے لیے موجیں مار رہا ہے۔ جو سُریلے راگ مسعود سعد سلمان
اور خسرو نے ملکی زبان میں نکالے تھے وہ میر اور غالب، درد اور سودا، انیس اور
میر حسن کے پیچھے بن گئے ہیں۔ جو آواز اس ہندوستانی شاعر نے ملک کی حمایت
اور محبّت میں بلند کی تھی وہ آج تمام ملک کی صدا ہو گئی ہے اور آواز باز گشت کے طور
پر حالی اور اقبال کے دلکش نغموں میں سنائی دیتی ہے۔ مبارک ہے وہ شخص جو تاریخ کے
صحیح رجحانات کو پہچانتا اور اُن کی تائید اور ترقی میں ساعی ہو کر بعد کی نسلوں میں اپنا
نام ہمیشہ کے لیے نیکی اور محبّت کے ساتھ یاد کیے جانے کے واسطے چھوڑ جاتا ہے۔

آؤ اس تمہید کو ختم کرنے سے پہلے مثنوی قران السعدین کے اخلاقی نتیجے پر
غور کریں۔ جس طرح باپ اور بیٹے میں اختلاف کے بعد صلح ہو گئی جسے شاعر نے مبارک

سمجھ کر "قران السعدین" قرار دیا اسی طرح ملک کا پریشان شیرازہ آپس کی محبت سے یکجا ہوسکتا ہے۔ اُس وقت کے لیے قران السعدین سے خسرو کی یہ غزل بطور "پیام اُمید" سُن رکھنی چاہیئے۔ جن سچے اور پاکیزہ انسانی جذبات کی ان اشعار میں ترجمانی کی گئی ہے اُن کی صحیح قدر اُسی وقت ہوسکتی ہے جب ہم اُن سے اخوت و یگانگت کو مضبوط کرنے اور محبت و رواداری کو ترقی دینے میں مدد لیں، جس کے ساتھ مستقبل وطن کی اُمیدیں وابستہ ہیں ؎

خرم آں لحظہ کہ مشتاق بیارے برسد — آرزومند نگارے بہ نگارے برسد

دیدہ بر روئے چو گل بندد و نبود خبرش — گرچہ در دیدہ ز نوکِ مژہ خارے برسد

لذتِ دیدنِ دیدار بجاں کار کند — جانِ بیکار شدہ باز بکارے برسد

گرچہ در دیدہ کشد ہیچ غبارش ننمود — ہر کجا از قدمِ دوست غبارے برسد

لذتِ وصل نداند مگر آں سوختہ — کہ پس از دوریِ بسیار بیارے برسد

قیمتِ گل نشناسد مگر آں مرغِ اسیر — کہ خزاں دیدہ بود پس بہ بہارے برسد

خسروا یار تو گر می نرسد خود می کوے
بہرِ تسکینِ دلِ خویش کہ آرے برسد

(صفحہ ۱۹۲)

سید حسن برنی

(کاتب [illegible])

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ کالج میں طبع ہوئی